مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات

پر

ایک نظر

مسعود عالم ندوی

مکتبۂ دین و دانش، بانکی پور، پٹنہ

مولانا سندھی اور اُن کے افکار و خیالات

پر

ایک نظر

از

مسعود عالم ندوی

مع مقدمہ

از

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

محمد تقی الدین نعمانی نے برقی پریس سبزی باغ بانکی پور پٹنہ میں چھپوا کر مکتبہ دین و دانش سے شائع کیا۔

قیمت عمر ۱۲/

تعداد طبع
بار اول	ایک ہزار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

زیرِ نظر کتاب میں راقم کے دو مضمون شائع ہو رہے ہیں جو اس نے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" اور پروفیسر محمد سرور کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و تعلیمات" پر تنقید اور استدراک کے طور پر لکھے تھے، پہلا مقالہ مولانا کی زندگی میں شائع ہوا (معارف، فروری۔ مئی سنہ ۴۳ء) اور ان کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ناقد کو مسلسل پانچ خط بھی لکھے، جس میں انھوں نے اپنے افکار کی مزید توضیح کی تھی، وہ خطوط بھی اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں، تاکہ مولانا کے افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ نیز اسی "استدراک" کے سلسلے میں مولانا نے بسترِ علالت سے (وفات سے تقریباً دو ہفتے پیشتر) ایک خط اپنے پرائیوٹ سکریٹری (پرسنل اسسٹنٹ) سے لکھوا کر بھجوایا تھا، وہ بھی ان "خطوط" کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے۔ ان خطوط کے علاوہ مولانا نے برہان دہلی (مئی سنہ ۴۳ء) میں بھی اپنے افکار کی مزید تشریح اور استدراک کے بعض شبہات کی تصحیح کی تھی۔ برہان کے اس مضمون اور ان کے تمام خطوط میں تقریباً ایک ہی خیال کا اعادہ کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون جون سنہ ۴۴ء میں لکھ کر معارف کو بھیجا جا چکا تھا مگر اتفاق یہ کہ وہ جولائی یا اگست میں نہ چھپ سکا، اور اسی دوران میں مولانا سندھی کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خبر سنتے ہی دل بیٹھ گیا، اور افکار و عقائد کے انتہائی اختلاف کے باوجود یہ صدمہ صبر آزما ثابت ہوا۔ اللہ ان کا مقام

بلند کرے اور ان کی خدمات کے عوض ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے ——

—— ایسے بالغ نظر، انتھک کام کرنے والے اور وسیع القلب انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوں تو شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک پر استدراک کے چھپتے ہی کتابی صورت میں اس کی اشاعت کا تقاضا شروع ہو گیا تھا، مگر کاغذ کی کمیابی اور دوسری مشکلات کے باعث یہ تقاضا اب سے پہلے عملی جامہ نہ پہن سکا۔ خیال تھا کہ اشاعت کے وقت بعض مضامین کا اضافہ ہو سکے گا، نیز "برہان" میں مولانا کی بعض جدید توضیحوں کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جا سکے گا، مگر اب کہ مولانا ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، دل و دماغ مزید کاوش کے لئے تیار نہیں۔ یہ مقالے بھی احساس فرض سے مجبور ہو کر شائع کئے جا رہے ہیں اور حاشا! وکلا!! ان سے مولانا کی تردید نہیں بلکہ ان کے افکار و خیالات کی تنقید و تنقیح مقصود ہے۔ کتاب پڑھنے سے یہ بات واضح ہو گی کہ ہم مولانا کے "نئے افکار" سے متفق نہیں، اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ ان کے "جدید نظریے" کتاب و سنت کے صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، اس لئے ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں، خواہ اس میں جذبات محبت و عقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو؟ کہ حق کی تائید تعلقات و محبت کی پاسداری پر مقدم ہے:

فالحق اولی من ولیک حرمۃ
والحق منک بنصرۃ وکفاح

کاغذ کی نایابی اور ہوش ربا گرانی کے اس دور میں شاید یہ کتاب شائع نہ ہو سکتی، اگر محب محترم مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف (فیروز پور) کا پیہم اصرار نہ ہوتا، اور برادر عزیز

مولوی محمد تقی الدین صاحب نعمانی (منیجر مکتبہ دین و دانش، بانکی پور، پٹنہ) کی مستعدی دوسری مشکلات کے حل کی کفیل نہ ہوجاتی، اور ان کے ساتھ برادر عزیز سید محی الدین صاحب اصلاحی ندوی مالک برقی پریس پٹنہ کاغذ کی فراہمی کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے لیتے۔ اللہ ان صاحبوں کو اجر دے، کہ محض لوجہ اللہ انہوں نے یہ تکلیف برداشت کی۔ اور ایک دینی و علمی خدمت کی انجام دہی میں ایک نحیف و ناتواں بندے کا ہاتھ بٹایا۔

آخر میں استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی (امتعنا اللہ بطول بقائہ) کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے خادم کی درخواست پر ایک بے لاگ اور دل نشین مقدمہ تحریر فرما کر کتاب کی عزت بڑھائی، اور ناظرین کتاب کے لئے بصیرت اور روشنی کا سامان فراہم کیا۔ فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

ہندرو، پٹنہ
۲۵ رمضان المبارک سنہ ۶۳ھ

عاجز
مسعود عالم ندوی

مقدمہ

از

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

یورپ کے مادی عروج اور مسلمانوں کے مادی تنزل نے ایک زمانے سے مسلمان مفکرین کو مضطر اور بے چین بنا رکھا ہے، مسلمان مفکرین میں سے سید جمال الدین افغانی نے اس کا علاج اتحاد اسلامی تجویز کیا، اور یہ دعوت دی کہ تمام مسلمان حکومتیں اور قومیں باہم متحد ہو کر یورپ کا مقابلہ کریں۔ اسی اتحاد اسلامی کا نام پین اسلامزم ہے، مرحوم نے اپنے اسی مجوزہ پروگرام کی خاطر گھر بار چھوڑ کر ہندستان، ایران، مصر اور ترکی اور پیرس میں دن گزارے اور اپنے مشہور عربی رسالہ العروۃ الوثقیٰ کے ذریعہ سے مسلمان اقوام کو اس کی دعوت دیتے رہے، اور آخر اسی دعوت کی کوششوں میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

ہندستان میں سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے تنزل کا سبب جدید یورپین علوم و فنون، و اختراعات و تمدن سے ناواقفیت کو قرار دیا۔ اور اس کا علاج ایک ایسی درسگاہ کا قیام تجویز کیا جو مسلمانوں کو یوروپین تمدن و معاشرت اور علوم و فنون و مخترعات سے آراستہ کرے، ان کا قول تھا کہ مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز

بن جاؤ۔

قومیت پرست یورپ کے اثر سے مصر، ٹرکی و ایران میں اسلامیت کے بجائے "وطنیت" کی دعوت شروع ہوئی۔ جس میں یہ قرار دیا گیا کہ اتحاد اسلامی کے بجائے "اتحاد وطنی و قومی" کی بنیاد پر نئی تعمیر شروع کی جائے۔ چنانچہ ان سب ملکوں میں "وطنیت" کی دعوت نے بڑا حسن قبول حاصل کیا۔ مصر میں مصطفےٰ کامل، ایران میں مفتی زادہ وغیرہ نے اور ٹرکی میں نوجوان ترکوں نے اپنے انقلاب کے لئے اسی راستہ کو اختیار کیا۔

گذشتہ جنگ میں روس کے کامیاب انقلاب نے ایک اور منظر پیش کیا، جس سے سوشلزم، بالشویزم، کمیونزم وغیرہ کی تحریکیں سامنے آئیں۔ ان کو دیکھ کر بعض مسلمان متفکرین نے اسلامی نظام سیاست و اقتصاد و معاشرت کو بھی اسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی۔ ادھر جرمنی اور اٹلی میں اس کے رد کے طور پر "نازی ازم" اور "فسزم" نے جنم لیا۔ بعض مسلمان نوجوانوں کو جن میں کچھ مذہبی درد تھا اسی جنگی اور آمرانہ نظام میں مسلمانوں کی نشأت ثانیہ کا خواب نظر آیا۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے جو مسلمان نوجوان یورپ کو گئے وہ سوشلزم یا نازی ازم میں سے کسی ایک کے شکار ہو کر واپس آئے۔ پہلا نظریہ دہلی کے خیری برادرس کی جماعت اسلامی، اور امرتسر کے مشرقی صاحب کی خاکسار تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خیری بھائیوں کی تحریک تو ان کے گھر کی چار دیواری ہی میں محدود رہی۔ ان کا بڑا زور وحدت آمریت پر ہے لیکن مذہبی اصول و فروع میں انھوں نے تاویل و ترمیم نہیں کی۔ لیکن مشرقی تحریک نے وحدت آمریت کے ساتھ عسکریت پر زور دیا اور کوشش کی کہ اسلام کے پورے دین کو انہیں دو اصولوں پر ڈھال دیں، اور ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کے

تنزل کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ سراسر ماورار الحیاۃ زندگی پر مرے ہوئے ہیں' اس لئے ان کو بتایا کہ ان کی جنت و دوزخ اسی دنیا میں ہے! یورپ کی زندگی کا باغ و بہار یہ 'جنت ارضی' اور مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی' ان کا دوزخ ہے۔ اس لئے آج یورپ' اصلی مسلمان' اور مسلمان حقیقی کافر ہے۔

ہندستان پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہوئی کہ عین تنزل اور سقوط کے آغاز میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وجود نے مسلمانوں کی اصلاح و دعوت کا ایک نیا نظام مرتب کر دیا تھا۔ اور وہ 'رجوع الی دین السلف الصالح' ہے' اس دعوت نے ہندستان میں فروغ حاصل کیا۔ اور گو سیاسی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ تاہم نظری و مذہبی و علمی حیثیت سے اس کی جڑیں مضبوط بنیادوں پر قائم رہیں' جن کو ہندستان کا سیاسی انقلاب بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا۔ اس سیاسی انقلاب کے بعد گو اس دعوت کے ارکان ہندستان کے مختلف اسلامی ریاستوں کو یا ہندستان سے باہر حجاز کو ہجرت کر گئے۔ مگر چند باہمتوں نے اسی نظری و مذہبی و علمی نظریوں کی دعوت اشاعت اور تعلیم کی غرض سے دیوبند اور سہارنپور میں اسلام کی مذہبی درسگاہوں کی بنیاد رکھی' اور ان کے ذریعہ سے افغانستان سے حجاز تک اس تحریک کو پھیلا دیا۔ اس تحریک کا اولین اصول یہ تھا کہ اسلام کو بدعات سے پاک کر کے علم و عمل میں سلف صالحین کی راہ پر چلنے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے! اور مسائل فقہیہ میں فقہائے محدثین کے طرز کو اختیار کیا جائے۔[۱]

---

[۱] لوگوں نے اس کو بھی مختلف فیہ مسئلہ بنا رکھا ہے کہ وہ فقہ میں کیا تھے؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اپنے سوانح الجزء اللطیف کے آخر میں پتے کو خود ہی بتا دیا ہے کہ وہ کیا تھے؟ فرماتے ہیں:۔ "وبعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشان

اسی زمانے میں یمن اور نجد میں اس تحریک کی تجدید کا خیال پیدا ہوا۔ جس کو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں کے شروع میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے مصر و شام میں شروع کیا تھا۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ائمہ مجتہدین کی منجمد تقلید اور بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں یہ تحریک ہندستان تک بھی پہنچی اور خالص ولی اللّٰہی تحریک کے ساتھ آکر منضم ہو گئی۔ اسی کا نام ہندستان میں اہل حدیث ہے۔

ولی اللّٰہی تحریک کی یہ دونوں شاخیں، تقلید و عدم تقلید کے مباحث کے علاوہ اصول میں تقریباً ایک تھیں، مگر افسوس ہے کہ ان فقہی فروعات کو ان دونوں نے یہ اہمیت دی کہ ہندستان کے طول و عرض میں سالہا سال تک دست و گریباں ہو کر اپنے اصل مقصد سے ہٹ گئیں۔ یہ دیکھ کر ندوۃ العلما کے نام سے ایک اور دعوت پیدا ہوئی، جس نے ان فروعات میں اپنا مسلک صلح کل تجویز کیا۔ اور چاہا کہ دونوں کو بغل گیر کر کے اصل مقصد کی طرف متوجہ کرے، اور یہ دیکھ کر کہ جب تک ہمارے علمائے کرام کے تعلیمی نظام میں تبدیلی نہ ہوگی وہ علما، پیدا نہیں ہو سکتے۔ جن کی ضرورت اس وقت کے مسلمانوں کو ہے، اس تعلیمی نظام کے دو جز اہم تھے' ایک یہ کہ اسلامی فرقوں کے باہمی فروعات کے جنگ و جدال کو بند کر کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے' دوسرا یہ کہ یونانی علوم کو جن کو صرف بضرورت ہمارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا۔ ان کو علیحدہ کر کے ان کے بجائے یورپ کے وہ جدید علوم اختیار کئے جائیں جن پر موجودہ عقلیت کی بنیاد ہے

احادیث نبوی متمسک بیشان است اقرار داد طریقہ ئہ غیر روش فقہاء محدثین افتاد۔"

گذشتہ جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کی بربادی اور ممالک اسلامیہ کی تخریب نے ہندستان کے اُن مسلمانوں کو جو اب تک اپنے کو ایک خلافت کے مرکز سے وابستہ سمجھتے تھے، بے حد متاثر کیا۔ اس سے خلافت کے نام سے ایک نہایت پُرجوش تحریک کا آغاز ہوا جس کی وسعت میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کی ہر مسلمان قوم آگئی۔ یہ حقیقت میں اتحاد اسلامی کی تحریک کا آخری سنبھالا تھا۔ خیال تھا کہ یہ قوت شاید مسلمانوں کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لائے گی۔ اس تحریک کے تین اصول اساسی تھے۔ مسلمان خلافت الٰہی کے حامل ہیں۔ ان کا ارضی مرکز جزیرہ نمائے عرب اور سیاسی مرکز ترکی خلافت ہے۔ لیکن عین اس وقت جب یہ تحریک شباب پر تھی، مصطفےٰ کمال پاشا نے الغائے خلافت کا اعلان کیا۔ اور ترکی کو اسلامی اقوام کی نمائندگی کے عہدہ سے علیحدہ کرکے ایک ترکی قوم کی بنیاد ڈالی۔ جس نے اسلام کے ہر رشتہ کو توڑ کر یورپ کے ہر نظام کو ترکی قومی رنگ دے کر قبول کر لیا۔ اس اعلان نے ہندستانی مسلمانوں کی خلافت نام اسلامی تحریک کی قوت کو بالکل ختم کر دیا۔

زمانہ کی نیرنگی دیکھئے کہ پنجاب کے علاقہ سیالکوٹ میں ایک سکھ خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس نے سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا، اور بعض علماء کے زیر تربیت عربی تعلیم حاصل کی اور مزید تکمیل کے لئے وہ دیوبند کی درسگاہ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ میں پہونچ گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر عبید اللہ سندھی کے نام سے روشناس ہوا۔ ظاہری تعلیم کے ساتھ وہ اس جوش جہاد سے بھی آشنا ہوا جو منت بانی سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما کے دلوں میں موجزن تھا۔ اور جس کو ان دنوں مولانا ابوالکلام کا الہلال نئی حرکت دے رہا تھا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں

ٹرکی و جرمنی کے اتحاد کی قوت کے بھروسہ پر بعض مذہبی و سیاسی ارباب فکر کے خیال میں آیا کہ یہ وقت ان کے پرانے منصوبے کے پورا ہونے کے لئے سب سے موزوں ہے۔ چنانچہ کچھ کام شروع ہوا مگر ابھی آغاز ہی تھا کہ قید و بند کی زنجیروں نے ان میں سے اکثروں کو قبل از وقت بیکار کر دیا۔ شیخ الہندؒ نے اپنی جماعت کے ساتھ حجاز کو ہجرت کی اور آخر وہاں بھی پناہ نہیں ملی اور مالٹا میں اسیر رہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے بعض رفقاء نے ہندستان سے نکل کر آزاد سرحد اور افغانستان کا رخ کیا۔

قلم یہاں تک پہونچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی! رحمہ اللہ تعالیٰ ۔۔۔۔ یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ "دین" کا ہے۔ پھر گو وہ خود اس دنیائے دنی سے رخصت ہو گئے۔ مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعت دوام بخش گئے ہیں۔ اس لئے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیر بحث آتے ہی رہیں گے۔ تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی اور اس کی دنیاوی برتری کے لئے ان کے اندر بڑا جوش تھا۔

سلسلہ بیان یہ تھا کہ پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر ۱۹۱۵ء میں وہ افغانستان چلے گئے۔ جہاں وہ مسلسل سات برس تک مقیم اور وہاں کے سیاسیات سے الجھتے رہے پھر یہاں کی فضا کو بدلتی دیکھ کر ۱۹۲۲ء میں وہ روس چلے گئے جہاں بالشویکی انقلاب پورے زور پر تھا۔ یہاں وہ اس بالشویکی تحریک سے اچھی طرح متاثر ہوئے ۱۹۲۳ء کے قریب وہ روس سے بھی نکل گئے اور مصطفےٰ کمال پاشا کی ٹرکی میں جا کر مقیم ہوئے اور وہاں چاہ

سال کے قریب رہ کر وہ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ ہو کر سلطان ابن سعود کے عہد میں حجاز چلے گئے۔ اور وہاں بارہ سال تک رہے، جہاں سے وہ آخر ۱۹۳۹ء میں ہندستان آئے۔

یہ مختصر تاریخ اس لیے لکھ دی گئی کہ ان کے خیالات کے سمجھنے میں اس سے مدد ملے۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جو دفعتہً کسی تالاب سے سمندر میں پہونچ جائے، ان کا تعلق ایک ایسے حلقہ سے تھا جس کو یورپ کے نئے سیاسیات سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ لیکن دفعتہً واقعات نے ان کو سیاسیات عالم سے الجھا دیا، اور وقت کی اہم تحریکوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ خالص ملحدوں اور فاسقوں اور سیاسیوں اور انقلابیوں سے ملنے اور یورپ کے مختلف سیاسی و معاشرتی و اقتصادی نظامات کے دیکھنے اور ان کے نظریوں کے سننے کا موقع ملا۔ معلوم نہیں کہ جہاں وہ رہے وہاں کی کوئی زبان بھی ان کو معلوم تھی یا نہیں۔ بہرحال یورپ کے ان سیاسی نظریوں اور انقلابی تحریکوں سے ان کے خیالات میں چکاچوند سی لگ گئی، ان کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ وہ کسی طرح اسلام کو اس نئی تحریک سے منطبق کر دیں، بہرحال انہوں نے روس سے سیاسی انقلاب کا سبق اور ٹرکی سے تجدد کا فن اخذ کیا۔ اور پھر جدید ٹرکی کی وطنیت، اور یورپ کی ظاہری نقالی کے درمیان تطبیق کا نظریہ مرتب کیا۔ مختصر یہ کہ انھوں نے جدید روس اور جدید ٹرکی کو اپنے پرانے علوم پر منطبق کر کے ایک نظام تیار کیا جس کو لے کر وہ ہندستان وارد ہوئے، اور حکمت ولی اللہ کے نام سے اس کو پیش کیا۔

ان کے نزدیک اس زمانہ میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندستانیت اور اسلامیت کو کیوں کر منطبق کیا جائے، اس کا جواب ان کے ذہن میں یہ آیا کہ جس طرح

دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں وطنیت کا دور دورہ ہے اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے نسلیت اور وطنیت کے اصول پر ملک کے مختلف طبقات کو جن میں مذہب کا اختلاف ہے متحد کیا جائے۔ قوم پرست عرب کہتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی عرب تھے، اور اب بھی عرب ہیں۔ ہم عیسائی ہوں یا مسلمان سب عرب ہیں۔ مصری کہتے ہیں کہ ہم عرب ہوں یا ترک، کرد یا قبطی ہم سب مصری ہیں، ہم کو فراعنہ پر فخر ہے۔ اور اہرام مصری کی بنیاد پر ہم اپنی قومیت کی بنیاد کھڑی کریں گے۔

اسی طرح ایران میں ایرانی نسل و وطن کی پرستاری میں مصروف ہیں، مسلم، زردشتی اور موحد و آتش پرست سب یکساں ایرانی ہیں۔ یہی حال جدید ترکی میں ترکی نسل کی دعوت کا ہے کہ اب وہاں چنگیز و ہلاکو پر فخر کیا جا رہا ہے، سلطان عثمان اور بایزید و سلیمان پر نہیں۔

مولانا سندھی نے اسی منظر کو دیکھ کر دین اور وطنیت میں تطبیق کی کوشش کی اور اس کے لئے انھوں نے اسلامی حقائق کی تشریح میں ایسی تاویلات کیں کہ وہ ان کے فلسفہ پر منطبق ہو جائے بعض حقائق صحیح بھی ہیں تو ان کی تعبیر کا طرز ایسا اختیار کیا گیا جس سے وہ موحش ہو گئے ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جن کو وہ صحیح متفقہ اصول سے بھی اخذ کر سکتے تھے مگر انھوں نے ان کے لئے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا، مثلاً "وحدت انسانیت" کے مسلک کو "وحدۃ الوجود" کی سنگلاخ زمین کے بجائے کتاب و سنت کی صاف راہ مساوات بنی آدم پر مبنی کر سکتے تھے جس کے نصوص قرآن پاک و احادیث میں موجود ہیں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ دین اور وطنیت کی تطبیق کے لیے عربی اسلام کو ہندی اسلام بنا کر یہاں کی

وطنیت سے قریب کر دیا جائے، تاکہ وہ اس ملک آریہ ورت میں بیگانہ نہ سمجھا جائے اور اس طرح دین ہندستان میں وطنیت کے مہلک اثر سے بچ جائے۔ چنانچہ ان کو حنفیت سے اس لیے دلچسپی نہیں کہ وہ دلائل کے لحاظ سے قوی اور اپنی حجت کے لحاظ سے پُرزور ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان کی عصبیت اس لئے ہے کہ امام صاحب نسلاً غیر عرب بلکہ عجمی بلکہ ہندی بلکہ سندھی تھے، اور اس لیے حنفیت ہندیت ہے۔ ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سے اس لیے عقیدت نہیں کہ قرآن وحدیث سے اس کی تائید مل سکتی ہیں۔ اور ربط حادث یا قدیم کے فلسفیانہ معمے کا حل اس کے ذریعہ سے آسانی سے ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ یہ مسئلہ ہندو ویدانت میں بھی ایک طرح سے وحدۃ الموجود کی صورت میں ملتا ہے۔ اور اس لیے ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ عقیدہ مضبوط کڑی کا کام دے سکتا ہے، بلکہ اس کے ذریعہ وہ ساری انسانیت کو ایک کر سکتے ہیں؛ تصوف کو ہندو یوگ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی اسی اصل کی فرع ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے بابرکت خانوادہ سے اس لئے گرویدگی نہیں کہ ان کے برکات ہندستان میں من جانب اللہ مؤید اور مشاہد ہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ یہ ہندی نژاد خانوادہ ہے اور اس کی تلقینات وہدایات دتاویلات وتعبیرات کے اختیار کرنے سے وہ عربی اسلام کو ہندی اسلام بنا سکتے ہیں، اور اس سلسلہ سے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکبر ایک ہی 'ہندی دین الٰہی' کے مبلغ بنائے جا سکتے ہیں؛ لیکن دین کی تخریب کے لیے اس سے زیادہ بھی کوئی مہلک اور خطرناک راہ ہو سکتی ہے؟ جن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو اکبر کے نا تمام کام کا تکمیل کرنے والا بتایا جاتا ہے، اُن کا فتویٰ اکبر کے باب میں جو کچھ ہے، وہ ان کی کتاب "انفاس العارفین"

کے اِس فقرہ سے ظاہر ہے:-

"جلال الدین اکبر پادشاہ اُو را معظم و مفخم دانستے، و بعد ازاں کہ پادشاہ الحاد و زندقہ گرفت، آں رشتۂ الفت از ہم گسست، و تنفر تمام از ہر دو جانب بظہور پیوست" (ص ۱۶۰)

ایک طرف تو وطنیت کے یہ سلسلے ہیں، دوسری طرف مصطفےٰ کمال پاشا کی 'قدیم سے علحدگی اور یورپ کے جدید معاشرت، تعلیم، خط، لباس اور تمدن وغیرہ کی پیروی کا تخیل ہے جس کو مولانا نے اپنی 'وطنیت' کے نظریہ کے ساتھ آمیز کیا ہے، اور اس لئے عربی و فارسی خط کے بجائے لاطینی خط اور علماء کو کوٹ پینٹ اور ہیٹ لگانے کا مشورہ دیتے ہیں، تیسری طرف رُوسی انقلاب کے بعض دفعات کو شاہ ولی اللہ صاحب کی 'بدور بازغہ' اور 'حجۃ اللہ' وغیرہ کی مجمل و مبہم عبارات و اشارات کے بھروسہ پر اپنے نظام میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے مولانا سندھیؒ کے سارے افکار و خیالات کی اساسی بنیاد! جس کے ساتھ یورپین انقلابی نظریوں کے کچھ کچے پکے سُنے سُنائے اصول ہیں جن کو اسلامی مسائل کی چھان بین میں صرف کرتے رہے۔ التعجب! مسئلہ خلق قرآن کو عربیت اور عجمیت کی نزاع بتانا کس درجہ غلط بات کا دعویٰ کرنا ہے؟ ذرا دہ اُن علماء کے نسب و نسل و وطن اور زبان پر تو نظر کر لیتے جو اس نزاع میں ادھر یا ادھر سے شریک تھے۔ ایک خالص دینی مسئلہ کو جو درحقیقت، جیسا کہ امام ابن حنبل نے خود 'الرد علی الجہمیہ' میں اور امام بخاری نے 'خلق افعال العباد' میں لکھا ہے اسلام اور عیسائیت کی جنگ تھی، عربیت و عجمیت کی جنگ بتانا تعجب انگیز ہے۔ پھر مسئلہ کی جو تعبیر فرمائی ہے وہ معتزلہ کا مسلک نہیں، وہ تو اشاعرہ اور حنابلہ کا اختلاف ہے، جو مامون کے بہت بعد

وجود میں آیا، مولانا کا یہ کہنا کہ عجمی ذہن و عقل کے لئے اللہ کی عالمگیر تعلیم کی کتاب کا حرف عربی زبان میں الہام قرآنی ہونا سمجھنا ناممکن ہے، عرض ہے کہ اگر ایسا سمجھنا محال ہے تو آریوں سے کہیں کہ وہ ویدوں کو عالمگیر دین کی کتاب نہ کہیں اور نہ سنسکرت کو الہامی سمجھیں، ایک عجمی نہیں بلکہ ہندی کے ذہن کے لئے یہ ناممکن ممکن کیوں کر ہو گیا، اس مقام پر مولانا کے لئے ضرور تھا کہ "قرآناً عربیاً" اور "حکماً عربیاً" کی بھی مناسب تاویل کر دیتے تاکہ قرآن پاک کے ساتھ عربیت کے وصف کا عارضی ہونا مسلمانوں (جن کو وہ "عامہ" کہہ رہے ہیں) کے نزدیک مسلم ہو سکتا۔ اسی طرح اسلامی تصوف کو "جوگ" اور "ویدانت" سے ماخوذ بتانا محض یورپ کی آواز کی نقالی ہے، جس کو اس کا دعویٰ ہو اس کو چاہیئے کہ ائمہ تصوف کے رسائل و مسائل کے حوالہ سے اس کو ثابت کرے، اگر کسی نے "جوگ" کا ایک آدھ شغل اختیار کر لیا ہو تو اس سے پورا علم اور پورا فن "جوگ" نہیں ہو جائے گا، کیا طبیبوں نے اگر بیدک کے ایک دو نسخے اپنی کتابوں میں لکھ دیئے تو اس سے پورا فن طب "بیدک" ہو جائے گا؟

مولانا سندھی کے افکار و خیالات کی بوالعجبی کا پتہ اہل دیوبند کو ۱۹۱۲ء ہی میں مل گیا تھا۔ جب وہ موتمر الانصار کی دعوت لے کر اٹھے تھے اور آخر وہ موتمر سے دست کش ہو کر دلی میں مسجد فتح پوری کے اندر نظارۃ المعارف القرآنیہ بنا کر بیٹھے، اور چند انگریزی و عربی کے فارغ التحصیل اور نیم فارغ التحصیل طلبہ کو قرآن کا درس دینے لگے، ان کے اس درس کا منشا یہ تھا کہ پورے قرآن کو جہاد و سیاست ثابت کیا جائے، اور تمام احکام کو اسی جنگی رنگ میں پیش کیا جائے، اس تفسیر کی جھلک آپ کو ان کے تلامذہ مثلاً خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی کی تفسیر اور مولانا احمد علی صاحب

لاہوری کے ذاتی حواشی میں پوری طرح نظر آئے گی۔ افغانستان پہونچکر ان کے مذہبی خیالات کے تغیر کی خبر خواص کو برابر پہونچتی رہی اور تردید کرنے والے تردید کرتے رہے، اور روس و ترکی پہونچ کر تو ان کے خیالات کا انقلاب اوج کمال تک پہونچ گیا۔ ان کے قیام حجاز کے زمانے میں جو لوگ ہندستان سے حجاز کو جاتے رہے اور ان سے ملتے رہے، وہ ان کے اجنبی اور بیگانہ خیالات کو سن کر جس عقیدت سے ان کی مجلس میں جاتے تھے، اُس عقیدت کے ساتھ واپس نہیں آتے تھے، ان کی ہندستان کی واپسی کا سیاسی و مذہبی دونوں گروہوں کو انتظار تھا۔ لیکن افسوس جب وہ واپس آئے تو نہ تو وہ پہلے گروہ میں مقبول ہوئے اور نہ دوسرے گروہ میں ــــــ یہ خاکسار بھی اُن لوگوں میں ہے جو ان کی ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اپنے بزرگوں کے اور ان کے تعلقات کے سبب سے ان کے ساتھ عقیدت رکھتا تھا اور مولانا بھی شفقت فرماتے تھے۔ لیکن جب سے معارف نے ان کے خیالات کی تردید میں حصہ لیا، وہ ارتباط باقی نہیں رہا۔

اب مولانا مرحوم اُس عالم میں ہیں جہاں ان کو نہ ہماری مدح وستایش سے کوئی فائدہ ہے اور نہ تردید و تنقید سے نقصان۔ اب وہ وہاں ہیں جہاں ان پر سارے حقائق منکشف ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کا مقام اعلیٰ کرے۔

آج کل کی تمام نئی تحریکوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ ان کے بانی و مبلغ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی اصلی غایت "اہل دین" کا دنیاوی فروغ اور ظاہری شان و شکوہ اور ملکیت ارض ہے اور اسی لیے ان کی نظر میں دینی احکام اور تعلیمات

سیاسی و اجتماعی ذرائع نظم و انتظام ہیں۔ اور یہ وہی ابلہ فریبی ہے جس میں کبھی باطنیہ اسماعیلیہ اور قرامطہ مبتلا رہے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کس نکتہ وری سے اپنی حسب ذیل عبارت[1] میں اس حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے:

الذین هم فی الباطن من الصابئة الفلاسفة الخارجین عن حقیقة متابعة المرسلین، الذین لا یوجبون اتباع دین الاسلام، ولا یحرمون اتباع ما سواه من الادیان، بل یجعلون الملل بمنزلة المذاهب والسیاسات التی یسوغ اتباعها وان النبوة نوع من السیاسة العادلة التی وضعت لمصلحة العامة فی الدنیا فان هذا الصنف یکثرون ویظهرون اذا کثرت الجاهلیة واهلها..... وهولاء لا یکذبون بالنبوة تکذیبا مطلقا بل هم یؤمنون	درحقیقت صابیوں میں ارباب فلسفہ کا جو گروہ ہے یہ لوگ بہ باطن وہی ہیں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جو اصل حقیقت ہے اس کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو دین اسلام کی پیروی کو ضروری نہیں خیال کرتے اور اسلام کے سوا دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان کی اتباع کو حرام نہیں سمجھتے بلکہ دنیا کے تمام ملل و ادیان کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مختلف طریقے اور سیاسی ادارے ہیں جن میں جس کا بھی جی چاہے پیروی کر سکتا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت بھی دراصل ایک قسم کی سیاست ہے لیکن ایسی سیاست جس کی بنیاد عدل اور توازن پر قائم ہے، خیال ان کا یہ ہے کہ عوام کی دنیاوی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر بنانے والوں نے بنا لیا ہے۔

---

[1] فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ممنون ہوں جنہوں نے اس عبارت کا نشان لگایا ہے۔ ان کا اصل خط "معارف" (ستمبر ۴۲ء) میں چھپ رہا ہے۔

ببعض احوالها ویکفرون
ببعض الاحوال، وهم متفاوتون
فیما یؤمنون به ویکفرون
به من تلك الخلال فلهذا
یلتبس امرهم بسبب تعظیمهم
للنبوة علی کثیر من اهل
الجهالات ، (منهاج السنة ج ۱ ص ۳)

.. ..

.. .. ..

اس قسم کے لوگوں کی کثرت اس وقت ہو جاتی ہے اور
اس زمانہ میں ان کا ظہور ہوتا ہے جب جاہلیت پھیل
جاتی ہے اور جاہلیت والوں کا اقتدار قائم ہو جاتا ہے....
نبوت کی تکذیب کامل طور پر مطلقاً یہ نہیں کرتے بلکہ بعض چیزیں
مانتے ہیں اور بعض چیزوں کا انکار کرتے ہیں پھر اس مسئلہ میں
یعنی نبوت کی کن باتوں کو مانا جائے اور کن کا انکار کیا جائے
ان کے خیالات میں باہم اختلاف بھی ہوتا ہے نبوات اور
پیغمبرانہ ہدایتوں کی چونکہ یہ احترام بھی کرتے ہیں اس لئے
ان کی اصل حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

ابن تیمیہ کی اس عبارت کو سامنے رکھ کر مولانا عبیداللہ سندھی نام کتاب کے اگلے دو ابواب ہی پڑھ لئے جائیں۔

آج کل یورپ کے موجودہ سیاسی تفوق، مادی تمدن کی چمک دمک، معاشرتی آزادی، دولت کی افراط اور عسکری قیادت آفرینی نے اچھے اچھے دینداروں کے پاؤں اکھاڑ دیئے ہیں، اور اس چیز کو جسے قرآن پاک نے ظاہراً من الحیٰوۃ الدنیا (روم) کہہ کر اہل ایمان کو اس سے بلندتر زندگی کی دعوت دی تھی، آج مسلمانوں کو اس سے نیچے اتار کر اسی ظاہراً من الحیٰوۃ الدنیا کی پست سطح پر قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، بلکہ اسی کو اصل زندگی بتایا جا رہا ہے۔ فیا اسفیٰ!

دین صرف اطاعت الٰہی کا نام ہے۔ اس لئے یہ شعبہ دین کی بلندی، اقامت اور اس کے کلمہ کے اعلاء کی راہ میں جد وجہاد اور قتال فریضۂ امت ہے، اور اس کے

پورے شعبوں کو بروئے کار لانے کے لیۓ اقامت دین کے اس شعبہ سے بھی چارہ نہیں جس کا نام زمین کی بالآخر قوت آمرہ یا حکومت دینیہ ہے' بلکہ خالص اطاعت الٰہی اور اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیۓ جس مومن کے دل میں مجبوریوں کے باوجود حصہ لینے کی تمنا اور آرزو یا حدیث نفس بھی نہ پیدا ہو وہ کمال ایمان سے محروم ہے لیکن یہ فرض حیات دنیا کی آرائش کے لیۓ نہیں' بلکہ حیات اخروی کے فوز و فلاح کی نیت سے ادا کیجیۓ ، مگر مولانا کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی صرف اس پر موقوف ہے کہ اس وقت بلا تامل" یورپ کے مادی اور معاشی زندگی کو قبول کر لیں " گو معلوم نہیں کہ یورپ کے مادی اور معاشی اصول' زندگی سے کیا مراد ہے ؟ تفصیل بتانا چاہیۓ'——

مولانا کا یہ کہنا ممکن ہے سچ ہو کہ' اب خلافت راشدہ دنیا میں لوٹ کر نہیں آسکتی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اسلام کو مطلق حکومت نہیں' بلکہ خاص نوع کی حکومت مطلوب ہے کیونکہ اسلام میں "استخلاف فی الارض" ایمان کامل اور عمل صالح کے ساتھ محدود ہے' اس لیۓ براہ راست "استخلاف فی الارض" کی ہر دعوت غلط ہے' اور ایمان کامل اور عمل صالح کی اصل دعوت دے کر اس کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض کی امید عین مطلوب ہے۔ پہلی دعوت کا منشاء صرف متاع الحیوٰۃ الدنیا کی تلاش ہے جس کی قرآن پاک نے تحقیر کی ہے اور دوسری دعوت عین اسلام اور عین دین ہے جس کا منشا اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ کی حقیقی تفسیر' اور اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ (دنیا تمہارے لیۓ اور تم آخرت کے لیۓ پیدا کیۓ گۓ ہو) کی اصلی تصویر ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ مولانا سندھی جیسا عالم متبحر یورپین انقلابات اور جدید سیاسی افکار میں الجھ کر حجاز سے ترکستان کی راہ چل پڑا۔ ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پر ان کے

خیالات کی بھی وفات ہو جاتی، مگر افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات کی ترتیب و تہذیب و اشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کر لیا ہے۔

ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کیے گئے اور ان کی دعوت پر دعوت دی گئی، بلکہ اس کی ترتیب و اشاعت میں بعض علماء نے بھی حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ان کے پہلے رسالہ میں شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک کے پورے سلسلہ کو آج کل کے لینن اور ٹراٹسکی اور راسٹالن کی شکل میں پیش کیا گیا اور ان خدا پرستوں کو دنیا پرست سیاسی پارٹیوں کے طرز دعوت کا نمائندہ بنایا گیا۔ اور یورپ کے سیاسی پارٹیوں کے اصول کو پیش کر کے اپنے مخالف پارٹی کے علماء کے قتل تک کی تحسین کی گئی۔ انا للہ!

یہ سب کچھ اس ہندستان میں ہوا جہاں بحمد اللہ علمائے دین اور مجاہدین حق کی کمی نہیں۔ مگر پورے ملک میں سے صرف مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ انہوں نے مولانا سندھی کی زندگی ہی میں ان کی تردید میں پُرزور مضامین لکھے اور پوری متانت اور تحقیق اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے افکار کی تنقید کی، اور اب الحمد للہ یہ متفرق نمبر ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ناقد مجیب کے اس رسالہ کو قبول اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ نصیب فرمائے۔

والسلام

لہ شاہ ولی اللہ اور ان کا سیاسی مرکز، ص ۲۰۲

خطوط

(۱)

محترم المقام مکرمی مولانا مسعود عالم صاحب زید مجدہٗ

سلام مسنون۔ معارف کے دونوں نمبر آج ملے۔۔۔ ہماری سیاحت میں ایسے حالات پیش آتے رہے کہ ہمارا سیاسی فکر بدل گیا، اسے ہم نہیں چھپاتے، کاش ہمارے دوست ہم سے اسباب انقلاب بھی سن سکتے۔ افسوس ہے کہ وہ حالات ہم لکھوا نہیں سکتے۔ اس کے بعد ان کی رائے سے ہمیں شکایت نہ ہوتی۔۔۔ آپ براہ مہربانی شیخ عبدالحق بنارسی کا ترجمہ "سلسلۃ العسجد" دیکھ لیں جو نواب صاحب نے سلسلہ اسانید سے آخر میں ذکر کیا ہے۔

۔۔۔ ان کے اخراج کا واقعہ ایک رسالہ میں چھپا ہوا ہم نے مکہ معظمہ میں پڑھا تھا، وہ رسالہ مولانا احمد سعید کے خاندانی کتبخانہ میں موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا مطبوع ہے۔ شاہ عبدالغنی کی اس پر مہر ہے، شاہ اسحاق قدس سرہ کے فتاوے بھی اس میں درج ہیں، اور سید احمد علی رامپوری کا مختصر بیان بھی مذکور ہے، اگر کہیں سے مل سکے تو اسے ضرور دیکھئے۔۔۔ ہمارا یہ فقرہ "کمپنی کی ڈپلومیٹک سازش" آپ غلط محمل پر لے گئے، اس قدر بدگمانی نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ مقصود تھا، جو مولانا حمید الدین مرحوم سے ہم نے سنا تھا کہ ان کے اطراف کے کوئی ملازم کمپنی سرحد پہنچ گئے، اور مجاہدین اور افغانوں میں نفاق کا بیج بو آئے، مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ مجاہدین مع اپنے سرداروں کے شہید ہو گئے۔ تو وہ اپنے آپ کو الٹا بند ہونا، اور کوڑوں سے پٹوانے یہ عمل نہ تھم رہے تھوڑے

وقفہ کے بعد مسلسل جاری رکھتے رہے۔

زیدیہ اثنا عشری کی طرح نہیں۔ مگر وہ شورائی حکومت نہیں برداشت کرتے امام خصوصی خاندان سے ہونا چاہیئے۔ ہمارا زمانہ اس سیاست کو برداشت نہیں کرسکتا۔ ان مسائل میں اختلاف رائے معیوب نہیں، مگر ایسی غلط فہمی نہ ہو جس کا اثر یہاں تک پہنچ جائے کہ مجاہدین کمپنی سے سازش رکھتے تھے۔ یہ ہمارا خیال ہے۔ یہ فقرہ ہم عرب انقلابیوں کے لئے تو استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کا وہ لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ ہم تو ہندی اور عربی انقلابیوں میں یہی فرق قرار دیتے ہیں کہ کمپنی عربوں کی امداد کرتی رہی۔ اور ہندیوں سے اس کا مقابلہ تھا۔ واللہ المستعان :

۲۶ مارچ ۱۹۴۳ء ہندی

عبیداللہ سندھی

---

(۲)

محترم المقام زید مجدہ سلام مسنون۔ آپ تنقید لکھ رہے ہیں، مبارک ہو۔ افکار اسی طرح صاف ہوتے ہیں۔ آپ کو مطالعہ میں مدد دینے کے لئے رات ایک خط لکھ چکا ہوں، وہ حضرت مولانا سید صاحب کے توسط سے آپ کو ملے گا۔ یہ دوسرا عریضہ براہ راست لکھ رہا ہوں۔ (۱) آپ نے مولانا ولایت علی کا مجموعہ دیکھ لیا ہے۔ غور سے مطالعہ کیجئے۔ مولانا سید صاحب (الامیر الشہید) قدس اللہ سرہ العزیز کو ہندی متوسط نہیں بنا رہے۔ (۲) (اسمٰعیل) میں ایک مجموعہ اربعین

؎ مجاہدین سرحدیہ کا مستقر۔

احادیث ہے جو سرتاپا موضوع ہے: وہ عام لوگوں کو نہیں دکھلایا جاتا۔ پنجاب کے کسی مطبع میں چھپوایا ہے۔ اس میں ایسی حدیثیں بھی درج ہیں کہ مہدی پشاور کے شمالی کوہستان میں ملے گا۔ نواب صاحب نے اسی مجموعہ کا ذکر کیا ہے'۔۔۔۔ (۳) کیا سوانح احمدیہ[1] کا مصنف الامیر الشہید کو انگریزی رعایا بنا کر پیش کرتا ہے' اس لیے یہ اچھا نہیں ہوگا کہ وہ اپنی تحریک کے ڈکٹیٹر تھے'۔ غلطیاں ہوئیں' مگر اماموں اور ڈکٹیٹروں کی سی غلطیاں ہیں'۔۔۔۔ گرتے ہیں شاہ سوار ہی میدان جنگ میں'۔۔۔۔ آپ مجھے ایسا خیال کریں' کہ دنیا کے لادینی ڈکٹیٹروں کے مقابلہ میں آنا چاہتا ہوں۔ یا متدین نوجوانوں کو ان کے مقابلہ کی ہمت افزائی کرتا ہوں۔ ہمارے متدین نوجوان کس راستہ سے آگے بڑھیں۔ وہ راستہ بتاتا ہوں: عزیزوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ غلطیوں پر متنبہ کریں۔ فوراً اصلاح کرلوں گا۔ مگر خدا کے لیے جمود چھوڑیں۔ آگے بڑھیں۔ ۔۔۔۔ میرا تجربہ ہے ہم اگر دلی کے بادشاہوں سے علحدہ ہوتے ہیں' تو کابل' قسطنطنیہ وغیرہ ممالک میں کہیں بار نہیں پاتے۔ یہ بادشاہ ہمارے ہیں' ان کے غلط کاروں کی غلطیاں پکڑنا ہمارا فرض ہے'۔۔۔۔ اپنے گھر میں پاؤں ٹکانے کے لئے جگہ نکالیے پھر مسلمانوں سے ملئے ان سے سیکھئے' اگر کوئی مفید بات آپ نے بزرگوں سے محفوظ کرلی ہے' تو دنیا کو تعارف کرائیے۔

کیا آج یوروپین مفکرین کے مقابلہ میں آپ اپنا مفکر پیش کرسکتے ہیں' کیا ان ڈکٹیٹروں

---

[1] سوانح احمدی کا مصنف الامیر الشہید کا تعلق امام عبدالعزیز سے کاٹنا چاہتا ہے غور سے مطالعہ کیجیے۔

چالاک مصنف غیر مسلم ہیں ان کی کتابیں یا ان کے اقتباس عربی رسالوں میں پڑھ چکا ہوں مکہ معظمہ کے دوران قیام میں۔ فقط

کی دنیا میں آپ اپنا ڈکٹیٹر اپنے لئے امام بنا کر آگے بڑھ سکتے ہیں"۔ خدا کرے کہ آپ کی تنقید مجھے ہمت دلائے کہ صحیح بات زیادہ صاف لفظوں میں لکھ سکوں۔ اللہ رب العزۃ ہم پر رحم کرے۔ کاش ہم کبھی مل بیٹھتے اور تدریجی انقلاب کی سیڑھیاں جس طرح ہم نے طے کی ہیں، آپ کو ان کا پتہ نشان بتلاتے۔ فیصلہ آپ کا وہی زیادہ صحیح ہوگا جس میں ہر قسم کے معلومات سامنے آجائیں۔

عربک کالج کی اسکیم ذاتی مطالعہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ والسلام

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۳ ہندی دار الرشاد عبید اللہ سندھی

---

(۳)

مکرمی المحترم سلام مسنون۔ کل اپریل کا معارف ملا۔ اس سے پہلے ایک پمفلٹ "البرہان" کو بھیج چکا ہوں جس میں بعض مجملات کی قدرے تفصیل ہے، اس میں حضرت سید صاحب کے مشورے کا بھی خیال رہا ہے، مگر بیمار ہوں اور کوئی کتاب بھی پاس نہیں اس لئے مختصر یادداشت کے طور پر لکھنا پڑا۔ اجماع کی تفسیر میں آپ ازالۃ الخفاء میں مذہب عمر کا رسالہ بلکہ اس رسالہ کا مقدمہ دو صفحے ضرور دیکھ لیں۔

—— امام شوکانی زیدی امیر یا امام کے قاضی رہے ہیں۔ ایک امیر کے وفات پر اس کے جانشین امام سے پہلے خود بیعت کی اور پھر عوام سے امام کے نام پر بیعت لینے کا واسطہ بنے کیا کوئی غیر زیدی یہ وظیفہ ادا کر سکتا ہے، ہمارا مطلب اس بحث سے امام شوکانی کی توہین نہیں جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہم نے ایک ایسا طائفہ دیکھا۔ جو حنفیہ کو مشرکین کے درجہ پر مانتا ہے، اور ہم ان کے ساتھ مدارات پر مجبور ہیں۔ انہیں لوگوں کو اپنی غلطی پر

معتنبہ کرنے کے لیے ہم نے زیدیت کی بحث چھیڑی تھی۔ کیا حقیقتاً زیدیت سے بھی زیادہ قابل انکار ہے؟ —— زیدیہ میں سے ایک محقق اہل السنۃ کے لیے قابلِ تقلید مل سکتا ہے۔ تو دیوبندی حنفیہ میں کیوں اس قسم کے عالم مستثنیٰ نہیں کیے جاتے۔ یہ واقعات مکہ معظمہ میں پیش آ گئے تھے اور ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اس مخمصہ سے ہمیں نجات ملی۔ ورنہ وہ لوگ ہمارے اخراج کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ —— ہمارا یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہم اپنے سیاسی انہماک کے غلبہ میں اسلامی فرقوں کی امتیازی چیزوں پر غور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن واقعات کی مجبوری سے بقدرِ ضرورت حصہ لینا پڑا۔ —— اب ہند میں معاملہ بالکل نئی صورت میں پیش ہو رہا ہے۔ "گاندھی ازم" کے مقابلہ میں ہمیں ایک فلاسفر پیش کرنا ضروری ہے۔ کیا ڈاکٹر اقبال کافی ہے۔ ڈاکٹر "نٹشے کو مانتا ہے" تو علامہ مشرقی "ڈارون کو"۔ میں گاندھی کے متبعین کے ڈر سے ان حضرات پر جرح بھی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر ان کی تقلید بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے اپنے لیے مخلص امام ولی اللہ کی فلاسفی کے سوا "کچھ نہیں دیکھا"۔ اسے آہستہ آہستہ پیش کر رہا ہوں۔

کیا امام ولی اللہ سیاسی متبوع بھی ہیں یا ان کی محض فکری بلند پروازی تھی۔ میں اپنے دیوبندی اساتذہ کی بنیاد پر ان کے سیاسی متبعین کا تسلسل قائم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بیماری اور پریشان حالی سے غلطیاں بھی صادر ہوتی رہیں گی۔ حسب الامکان اصلاح کرتا رہوں گا۔ ورنہ امید رکھتا ہوں کہ معاف کر دیا جاؤں گا۔

آپ فراخ دلی سے تنقید کریں۔ —— ہم آپ کی جماعت سے علٰحدگی اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ ہمارے اغلاط کی ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد نہ ہو۔ میں تو اس قدر

کمزور ہو چکا ہوں، کہ جنہیں میں اپنا سمجھتا ہوں وہ بھی منہ نہیں لگاتے ۔ اس لیئے ۵
اوروں پہ کیوں نزول بلا اپنے ساتھ ہو
اب ہم مکان شہر سے باہر بنائیں گے
کا معاملہ ہے۔ والسّلام ۔

۲۲ اپریل ۱۹۴۳ء بیت الحکمۃ ۔ دارالرشاد عبیداللہ سندھی

---

(۴)

مکرمی سلام مسنون ۔ آپ کا کارڈ ملا ۔ میرے خطوط پرائیوٹ ہیں ۔ محض آپ کو مطالعہ کے لیئے متوجہ کرنا منظور ہے ۔ رائے بدلنے کی کوشش یا پبلک میں مراقبہ منظور نہیں ۔ اگر خدا کو منظور ہے، اور ہم کبھی مل بیٹھے تو بہت سے معاملات پر مذاکرات کر سکتے ہیں ۔ اس وقت میں بیمار ہوں زیادہ عرض نہیں کر سکتا ۔ والسلام
تمام رفقاء محترم سلام مسنون قبول فرمائیں ۔

۲۳ مئی ۱۹۴۳ء سندھی
دارالرشاد ۔ گوٹھ پیر جھنڈا

(۵)

مکرمی المحترم زید مجدہ
سلام مسنون ۔ آج معارف دیکھا کل برہان دیکھ چکا تھا آپ کو وحدۃ الوجود کا مسئلہ سمجھنے میں ملیے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو کتابوں کو تشاندہی کر کے توسیع مطالعہ کے لیئے راستہ بنانے میں مدد دوں گا۔ ہم نے امام ولی اللہ کی حکمت کے تعارف میں کچھ اشارات لکھے ہیں بالفعل ان پر توجہ فرمائیے ۔

آپ کو شبہ ہے کہ میں نجدیت، یمن اور زیدیت اور تشیع میں شاید اچھی طرح فرق نہیں کر سکتا ـــــ میں بارہ سال عرب میں رہا ہوں۔ یمن اور نجد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے ملک میں نواب صاحب کے اعوان یمن سے تعلق رکھتے ہیں اور میاں صاحب کے شاگردوں میں غزنوی (امرتسری) خاندان نجد سے وابستہ ہے۔ یہ دونوں مرکز امام ولی اللہ کو مانتے ہوئے ائمہ یمن اور نجد کو ان پر ترجیح دیتے ہیں ـــــ کمپنی بہادر کے زمانہ میں یمن کے شیعہ علماء آتے رہے۔ وہ اپنے ادبی کمالات سے ہند کو متاثر کرتے رہے اور امام ولی اللہ کے فکر کے سخت مخالف تھے۔ اس کے بعد نواب صدیق حسن سے قدرے پہلے مولوی عبدالحق ہند میں ایک مرکزیت کے مالک بن چکے تھے اور وہ زیدی ہیں امام ولی اللہ کے فکر سے ہٹاتے ہیں۔ پھر نواب صاحب نے قاضی شوکانی سے اتصال پیدا کیا امام ولی اللہ کے مسلک سے مخالف دعوت شروع کر دی۔ براہ مہربانی ان معمولی معاملات کو اہمیت نہ دیا کریں۔

مولانا شہید کو امام ولی اللہ سے علحدہ فرض کرنے کی غلطی سے پرہیز کریں، مولانا شہید کی کتابوں کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔

آپ کا کارڈ مورخہ ۶ مئی ملا۔ شکریہ! یہ خط و کتابت محض دوستانہ ہے اور پرائیوٹ۔

والسلام

(۶)

۱۴ اگست ۱۹۴۴ء سندی　　　　　گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد سندھ

بجناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی دام عنایتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، — حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی

اس وقت بستر علالت پر ہیں، چند دن تک ان کی حالت نہایت تشویشناک رہنے کے بعد اب پھر اللہ کے فضل سے رُو بہ صحت ہے۔ کل آں ممدوح نے آپ کا استدراک جو آپ نے ان کی تاریخ تحریک ولی اللہ محدث دہلویؒ پر ماہ فروری تا مئی ۱۹۴۳ء کے شذرات میں "معارف" میں شائع کرایا تھا، پڑھوا کر سُنا، اور آج مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حضرت مولانا کی طرف سے تحریر کروں کہ ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی دعوت کو اسلام میں اول درجے کی چیز مانتے ہیں، ان کے بعد امام ولی اللہؒ کی تحریک کو دوسرے درجے کی دعوت کا مقام دیتے ہیں" —— آج کل ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس کے متعلق ہم نے اطمینان کے ساتھ امام ولی اللہ کی تابعداری میں اپنا پروگرام (Programme) بنا لیا ہے، اب ہم اس میں کسی دوسرے پروگرام (Programme) کو تداخل کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ براہ مہربانی ہمیں معاف فرمائیں" فقط والسلام

المخلص

بشیر احمد، بی اے

معتمد خصوصی حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک

(استدراک و تنقیح)

دنیا میں مظلومیتوں کی داستان بار بار دہرائی گئی ہے' تاریخ میں میدان جنگ کے ابتلا کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے. لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں بعض اکابر امت کی مظلومیت میدان شہادت کی مظلومیت پر بھی بازی لے گئی ہے' اور زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس خون کی چھینٹیں ان کے ماننے والوں اور نام برداروں کے دامن پر بھی ہیں.

جہاں تک تاریخی واقعات وحقائق کا تعلق ہے' یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی (۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء - ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور ان کے اصحاب سے پہلے اس خطۂ ارض میں کسی صحیح دینی تجدید وانقلاب کے لئے کوئی منظم اور ہمہ گیر کوشش نہیں کی گئی' اور ہندوستان تو ہندوستان' ساری دنیا میں عہد صحابہؓ کے بعد کوئی جماعت طریق نبوت اور اسوۂ نبوی سے اتنی قریب اور ہم آہنگ نظر نہیں آئی. لیکن حالات اور ماحول کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غیر تو غیر اپنوں میں بھی سید صاحبؒ اور ان کے مخصوص احباب کا فکر بلند' معتدل مزاج ومشرب اور مسلک وعمل میں عجیب وغریب توازن پورے طور پر نہیں سمجھا گیا' ہر فریق نے اپنے ظن وتخمین کے مطابق انہیں اپنانے کی کوشش کی' نتیجہ یہ ہوا کہ اس کھینچا تانی میں وہ فکر بلند' تو

آنکھوں سے اوجھل ہوگیا، اور اُن کے ماننے والوں اور پیروی کا دم بھرنے والوں میں تقلید و عدم تقلید، آمین، رفع یدین، وہابیوں میں نماز جمعہ اور اسی قسم کی چند فروعی مسئلے لڑنے جھگڑنے کے لیے رہ گئے، آغاز کیا تھا، انجام کیا ہوا، دیدۂ عبرت وا ہو تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

ہماری بدبختی یہیں ختم نہیں ہوتی، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی (ف ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) سے لے کر ولیم ولسن ہنٹر (W. W. Hunter)، راونشا (Y. E. Ravenshaw) اور جیمس اوکنلے (James O. Kinealy) تک کی دشنام طرازیاں برداشت کی جا سکتی

لہ مولوی فضل رسول صاحب نے ہندستان میں غالباً سب سے پہلے وہابی کی اصطلاح استعمال کی (ترجمان وہابیہ ص ۸۸ رسالہ اشاعۃ السنۃ ۱۳۰۱ھ ص ۲۱۲) نجد و ہندستان کے موحدین و مجاہدین پر رنگ برنگ کے الزامات دھرنے میں پیش پیش رہے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کے تذکرہ میں ان کا ذکر بڑے دلچسپ طریقہ پر آیا ہے۔ چند سطریں نذرِ ناظرین ہیں۔ "مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمٰن میں لکھتے ہیں "داؤد ظاہری شیطان کا متبع تھا، اس کے بعد ابن حزم ظاہری پیدا ہوا جو خبیث تھا، پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا اور ابن قیم کا شاگرد دمشقی ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا" بعض اشرار بد اطوار جہلہ فسقہ در حلقہ انقیاد ش آمدہ در بلاد اسلامیہ طرفہ هنگامہ بر پا نمودند"۔ اور ان تمام مورخانہ تحقیقات کے لیے آخر میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں، الخ الخ (تذکرہ ص ۲۲۶) ؎ ہنٹر صاحب جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما ہیں ان کی کتاب مسلمانان ہند (Our Indian Mussalmans) مشہور ہے اب اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

؎ راونشا ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ پٹنہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا، مولانا احمد اللہ صادقپوری (ف ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) کے مقدمے کی ابتدائی سماعت اسی نے کی تھی اس کا فیصلہ اور میمورنڈم بغوات و خرافات کا مجموعہ ہے، ہنٹر کی کتاب کا ایک حصہ اسی میمورنڈم سے ماخوذ ہے۔ ؎ اوکنلے صاحب بھی مجاہدین کے پرانے مشفق ہیں، سازش کے آخری مقدمے (۱۸۷۱ء مقدمہ پٹنہ بنام امیر خاں، حشمت داد خاں، ابراہیم منڈل وغیرہم) میں یہ سرکار کی طرف سے پیروکار تھے، بلاکشان الم کی پریشانیوں میں ان کا بھی کافی دخل رہا ہے۔

نہیں، کہ ان سے کلمۂ خیر کی توقع ہی کب تھی؟ مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحاب فکر ان نفوس قدسیہ کے منہ آئیں۔ ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں، ان کے ضرب المثل اخلاص پر شک کریں، تو پھر خواہ مخواہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمایش کا ہوتا ہے، ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی، کہیں بے ادبی نہ شمار کی جائے عرضِ مدعا سے روکتا ہے، دوسری طرف احساس فرض، اور یہ خوف کہ اگر سکوت سے کام لے کر غلطیوں کی تصحیح نہ کی گئی تو کہیں بزرگوں کی یہ لغزشیں آگے چل کر تاریخی حقائق نہ بن جائیں، اظہار مطلب پر اکساتا ہے، یوں تو مروت اور صداقت کی کشمکش ہمیشہ صبر آزما ہوا کی ہے، لیکن راقم کے لئے اس تحریر کے سلسلے میں یہ کشمکش بہت طویل اور تکلیف دہ رہی، آخر دو تین مہینوں کی ذہنی الجھن کے بعد دل و دماغ نے اظہار مطلب ہی کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور زبانِ قلم نے بسم اللہ کہہ کر استدراک کی بسم اللہ کی ہے۔

جناب مولانا عبید اللہ سندھی کی زیر نظر کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" "حزب امام ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ" کا مقدمہ ہے اصل مقدمہ کے آغاز سے پہلے "اجمالی فہرست" میں مضامین کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کا لب لباب اصل کے جملوں کو مقدور بھر محفوظ رکھتے ہوئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، تاکہ تفصیل میں پڑنے سے پہلے مقدمہ کا اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔

"حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۴۳ھ (۵ مئی ۱۷۳۱ء[1]) سے

---

[1] ۱۲ ذیقعدہ ۱۱۴۳ھ، ۵ مئی ۱۷۳۲ء کے مطابق ہوتی ہے، ۱۷۳۱ء صحیح نہیں۔

دہلی کے مقاصد کو ختم کرنے کے لئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا،

تاریخ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلاب فرانس سے ۵۰ سال پہلے ہو گذرا ہے حکیم الہند نے اپنا نصب العین معین کیا جمعیۃ مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلیں، اس طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس نے حکومت موقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) بنائی، لیکن ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ([1] ۶ مئی ۱۸۳۱ء) (بروز جمعہ) کو بالاکوٹ کے معرکہ شہادت کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا،

اس صدی میں اس تحریک کے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی۔

(الف) امام ولی اللہ دہلوی ۱۷۳۱ء - ۱۷۶۳ء،

(ب) امام عبدالعزیز دہلوی ۱۷۶۳ء - ۱۸۲۴ء،

(ج) امام محمد اسحٰق دہلوی ۱۸۲۴ء - ۱۸۴۶ء،

(د) حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۶ء - ۱۸۳۱ء۔

یہ تحریک کا پہلا دور تھا،

دوسرا دور، امام محمد اسحٰق نے شروع کیا، آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی، ان کے بعد الامیر امداد اللہ بارہ برس دہلی میں رہے یعنی ۱۸۵۷ء تک، اس کے بعد مکہ معظمہ میں،

---

[1] ۶ مئی ۱۸۳۱ء روز جمعہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ ہے نہ کہ ۲۷ ذیقعدہ، ۹ مئی دو شنبہ ہوگی، غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے سید صاحب کی شہادت ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کو ہوئی ہے (سیرت سید احمد شہید ص ۲۲۶)

ان کے پہلے نائب یعنی مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک، پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک، پھر شیخ الہند مولانا محمود الحسن ۱۹۲۰ء تک اس سال تحریک کا دوسرا دور ختم ہوا۔ تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔" (صفحہ ۲)

یہ ہے حزب ولی اللہ کی اجمالی تاریخ کے مقدمہ کا خاکہ جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کو بالکل ضمنی حیثیت دی گئی ہے، اور ان کے خاص ماننے والوں اور سالہا سال تک علم جہاد بلند کرنے والوں کے لیے تو اس خاکے میں کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اسلامی ہند کی پہلی اور (اب تک) آخری تحریک تجدید و انقلاب میں سید صاحبؒ کو ضمنی حیثیت دینا حقیقت و صداقت کا خون کرنا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی نے اس باب میں سید شہیدؒ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے، اور پھر امیر شہیدؒ (مولانا کی اصطلاح کے مطابق) کی اس "ضمنی حیثیت" کو بجا ثابت کرنے کے لیے ان کی طرف طرح طرح کی باتیں منسوب کی گئی ہیں، اور یہی پر بس نہیں، تحریک کے دوسرے دور میں مولانا محمد اسحٰقؒ سے مولانا محمود الحسنؒ تک مختلف افراد کی مسلسل امارت و امامت ثابت کرنے کے لیے سید شہیدؒ کے جاں نثاروں، پورب کے سرفروش مجاہدوں اور شہیدوں، سرکار انگریزی کے ممنون التفات اہل صادق پور[۱] بدنام وہابیوں اور عام جماعت اہل حدیث کو ندیت شخصیت،

---

[۱] اس فہرست میں صرف عیسوی سنہ دئیے گئے ہیں۔ [۲] صادق پور شہر عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک محلہ ہے، یہاں کا ایک ہاشمی خاندان عرصہ دراز سے علم و فضل میں ممتاز رہا ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب علم جہاد بلند کیا، تو اسی خاندان کے ایک ممتاز فرد مولانا ولایت علی رفیع ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء لبیک کہنے والوں کی صف اول میں تھے، اور پھر ان کی تبلیغ سے پورا خاندان سید صاحبؒ اور ان کی دعوت کا علم بردار ہوگیا اور اس سلسلے میں ان لوگوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ ٭ (بقیہ صفحہ ۷ پر)

رفض اور مختلف القاب سے اس بے دردی کے ساتھ نوازا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک وسیع النظر عالم اور ممتاز صاحب فکر کے قلم سے ایسی لغزش کیوں کر ہوئی؟ اور اسی لپیٹ میں یمن کے سلفی عالم و محدث قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ١٢٥٠ھ / ١٨٣٤ء) اور نجد کے مظلوم مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف ١٢٠٦ھ / ١٧٩٢ء) اور ان کے متبعین بھی آگئے ہیں، زیر تحریر استدراک کا مقصد انہی مظالم کا مداوا کرنا ہے۔

یوں تو راقم کو حزب ولی اللہ اور حکمت ولی اللہی کی نئی تفسیر و تشریح سے بھی اتفاق نہیں کتاب و سنت کے علاوہ کسی امام یا حکیم کے مرتب کردہ فلسفہ و حکمت کو دعوت کی اساس بنانا اسلامی نقطہ نگاہ سے صحیح نہیں، خواہ اس مخصوص فلسفہ و حکمت کے اجزائے ترکیبی تعلیمات ربانی ہی سے کیوں نہ ماخوذ ہوں؟ تجدید کا لبادہ

صفحہ ۵ کا بقیہ:-

۵ ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت (١٢٤٦ھ / ١٨٣١ء) سے لیکر ١٨٧١ء تک حکومت کی داروگیر کے باوجود مسلسل چالیس سال تک صادق پور والوں نے جہاد کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ پھانسی، جلاوطنی، حبس دوام، ضبطی اور ہر قسم کی ممکن اذیتیں انھیں دی گئیں، لیکن یہ اللہ کے بندے راہ حق سے نہ ہٹے۔ بڑی دردانگیز اور ولولہ خیز داستان ہے کبھی اطمینان سے سنائی جائے گی۔ سیرت سید احمد شہیدؒ (ص ٢٧٢-٣٠٥ جلد دوم) کے چوتھے باب میں بھی اس جماعت کی مختصر سرگذشت آگئی ہے۔ خاندانی حالات کے لئے مولانا عبدالرحیم صادق پوری اسیر پورٹ بلیر و متہم سازش انبالہ ١٨٦٤ء (ف ١٣٤١ھ / ١٩٢٣ء) کی تذکرۂ صادقہ ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جماعت کے کاموں کے متعلق بھی اس میں بکھرے ہوئے لیکن قیمتی معلومات ملتے ہیں۔

صرف قرآن کریم اور اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہونا چاہیے، ورنہ اشخاص و افراد کے نام پر جو تحریک بھی اُٹھائی جائے گی، اس کا کتاب و سنت کے صراط مستقیم سے ہٹ جانا ضروری ہے، اور اگر وہ تحریک اس گھاٹی سے بھی صحیح و سالم بچ نکلی، تو کم سے کم ایک نئے فرقے کا ظہور یقینی ہے، جو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل فتنہ ہے۔

یہ تو ایک اصولی بات تھی، ورنہ مولانا سندھی کی تفسیر کے مطابق حزب ولی اللہ اور حکمت ولی اللٰہی کے خمیر میں وقت کی بعض مقبول لیکن بر خود غلط تحریکوں کے جراثیم صاف نظر آتے ہیں، اکبر کے رسوائے عالم "دین الٰہی"[1] کی ترجمانی (صفحہ ۱۰۴) اور ابلیس کی بیٹی "نیشنلزم" کا زہر میخانہ مغرب کا فیض نہیں تو اور

---

[1] "اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، حکومت چلانے کے لئے بادشاہ اور اس کی انتظامی کونسل کا کیا طرز عمل ہوگا؟ اس کے لئے اکبر نے "دین الٰہی" کا فقرہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کی مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرفدار نہیں ہوں گے۔ مگر مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے کو آزاد نہیں کریں گے اور لا دینیت نہیں آنے پائے گی۔" (صفحہ ۱۰۴) کیا دین الٰہی کے متعلق یہ بیان تاریخی طور پر صحیح ہے؟ مزید تفسیر ملاحظہ ہو:۔

"ہماری رائے میں اکبر نے جو کام شروع کیا تھا وہ اساساً صحیح تھا اور عملاً غلطیاں اس لئے ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے آدمی میسر نہیں آتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتیں خدا تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعہ پوری کر دیں۔ شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کر دیا جو اکبر نے شروع کیا تھا کیوں کہ وہ بھی اسلام کو انسانیت کی تفسیر بتاتے ہیں۔ آپ تمام ادیان کو منطبق کر سکتے ہیں، ان کے ذریعے بھی ایک مسلم حاکم اس نظام سلطنت کو چلا سکتا ہے، جو اکبر کا مقصد تھا۔" الخ الخ (صفحہ ۱۰۵)

کیا اس کے بعد کسی رائے زنی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

کیا ہے ؟ آخر کیا بات ہے کہ شیخ الہندؒ کا شاگرد ہندستان چھوڑتے وقت تو اتحادِ اسلامی کا حامی تھا، اور واپسی کے بعد وہ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر کرتا ہے ؟

"جب ہم ہندستان سے نکلے تھے تو اتحادِ اسلام کے حامی تھے یعنی انٹر نیشنل پروگرام رکھتے تھے، مگر جب ہم واپس آئے تو اس وقت خالص نیشنلسٹ ہیں۔ یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا ہے۔" (ص ۱۶۶)

اللہ رے ! انقلابِ حال !! امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا شارح و مبلغ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے ! فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس جملۂ معترضہ سے یہ حقیقت ظاہر کرنا تھی کہ گو اس "انسداک" میں ہمارا روئے سخن زیادہ تر ان غلط بیانیوں کی طرف رہے گا جو حضرت سید احمد شہیدؒ، ان کے متبعین اور نجد و یمن کے دوسرے اکابر امت کے متعلق کی گئی ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حکمت ولی اللہ کی اس تشریح و تفسیر سے بھی ہمیں اتفاق ہے، جس کی تبلیغ اس کتاب میں کی گئی ہے، اور جس میں روس اور ترکی کے نمونے پر ایک نظامِ عمل "شاہ صاحب کا اجمالی پروگرام" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ (ص ۳۰-۳۵)

مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حزبِ ولی اللہ کے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ محمد اسحٰقؒ کو وہ آئمہ میں شمار کرتے ہیں، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کو حکومت موقتہ کے امیر کا درجہ دیتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ واقعات اس "بیان" کا ساتھ نہیں دیتے، پہلے تو یہ بسم اللہ ہی محلِ نظر ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کوئی سیاسی پارٹی بنائی تھی، تصنیفات میں وقت کے حالات اور ملکی مصالح کے متعلق اشارات کا ملنا اور بات ہے، اور

کسی سیاسی پارٹی کی تشکیل بالکل دوسری چیز ہے، جہاں تک پتہ چلتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اصلاح و تجدید کی نشاندہی اور صرف فکری تشکیل کی تھی، ان کے بنائے ہوئے خاکے کی تکمیل، عملی جد و جہد اور سرفروشانہ اقدام کا رتبہ بلند تکیہ رائے بریلی کے سید زادے اور خود اُن کے پوتے کے لئے مقدر ہو چکا تھا، (اللہ بالاکوٹ کی سرزمین پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، کہ وہاں ناموس ملت خواب میں ہے) بہر حال اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مولانا کی ہم نوائی میں حزب ولی اللہ کی تشکیل اور اس کی تمام تفصیلات کو تسلیم کرلیں تو ہمیں پچھلی ڈیڑھ صدی کی تاریخ از سرِ نو لکھنا پڑے گی، اس لئے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے بعد شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی امارت اور مرکزی حیثیت قبول کرلے میں تو کوئی دقت نہیں لیکن شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے بعد شاہ محمد اسحٰقؒ صاحبؒ کو حزب کا امام اور سید شہیدؒ کو ان کا ماتحت اور امیر بنا کر پیش کرنا حق و صداقت سے ٹکر لینا ہے، تاریخ جب آپ کے منشا کے مطابق نہیں بنی تو اب تاریخی حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے خیالات کا تابع بنانے کی کوشش کرنا بے سود ہے، اور مولانا سندھی کی یہی بنیادی مسامحت ہے جس نے اس تاریخی مقدمہ کو مفروضات اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔

اب آئیے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں، فاضل مصنف نے حضرت سید شہیدؒ کی امامت و امارت پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے پہلے مصنف کے اعتراف فضل کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک ان کے مقاصد سے تعارض نہیں ہوتا،

وہ سید شہیدؒ کے کمالات کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں:۔

"حضرت سید احمد بریلوی جوان کے مدرسہ کے شاگرد تھے، مگر قوت کشفی میں اپنے زمانہ کے عارفین بلکہ بہت سے متقدمین پر بھی سبقت لے گئے تھے، ان کی تربیت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی صحبت میں مکمل ہوئی (صت۴)

یہاں عاجز صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ سید صاحبؒ کو اس گھر سے صرف تلمذ ہی نہ تھا، بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت بھی حاصل تھی"، (سیرت سید احمد شہید طبع دوم صد۵۵)

اب اس "اعتراف کے بعد" مدح و ذم" کی آمیزش ملاحظہ ہو:۔

"شاہ عبدالعزیز کا پروگرام یہی تھا کہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بلایا جائے ..... اس کے لئے وہاں ایک امارت قائم کرنے کی ضرورت ہوگی، اور افغانوں میں ایک سید کی امارت بہت جلد مقبول ہو سکتی ہے، اس کے لئے سید صاحب کو امیر مقرر کیا گیا اور مولانا شہید اور مولانا عبدالحی کو ان کا وزیر بنا کر ساتھ کر دیا گیا" (صد۵۵)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "سید زادگی" کے سوا سید صاحبؒ میں اور کوئی خاص بات نہیں تھی، مگر اس پر بھی مولانا کو اطمینان نہیں، دنیا تو یہی جانتی ہے کہ پنجاب و سرحد میں احیائے جہاد کی ساری کوششیں سید صاحبؒ ہی کی دعوت اور جد و جہد کا نتیجہ تھیں، اس سے آگے بڑھ کر ذرا صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"سید صاحب اور مولانا شہیدؒ اور مولانا عبدالحی اس انقلابی پروگرام کے مرکز بنائے گئے، شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسحق کو اپنی جگہ مقرر کیا،

ہماری سمجھ میں اس نئے حزب کے امیر شاہ اسحٰق تھے، سید صاحب فقط امیر الدعوت والجہاد تھے، اور یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی ہے، اس کو ایک حکومت موقتہ کا درجہ دینا چاہیئے۔" (ص۵۰)

ان تین سطروں میں متعدد ایسی باتیں کہی گئی ہیں، جو تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ (الف) شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسحٰق کو کب مقرر کیا؟ یہ بیان محتاج ثبوت ہے، اور اس کے لیے مستند تاریخی شہادت کی ضرورت ہے (ب) سید صاحبؒ کو فقط امیر الدعوت و الجہاد کہنا بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کر رہے تھے، جن میں مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ "شیخین" کا درجہ رکھتے ہیں، اور فوری طور پر ان کے سامنے اصلاح رسوم و بدعات کے علاوہ پنجاب میں سکھوں سے جہاد کرنا تھا، گو ان کے مقاصد بہت بلند تھے، (ج) یہ کہنا کہ "یہ جماعت سلطنت دہلی کی کمزوری دور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی ہے"۔ سید صاحبؒ اور ان کے اعلیٰ مقاصد کی تنقیص ہے۔ سید صاحبؒ خالص اسلامی نظام چاہتے تھے، خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الٰہی کی تاسیس ان کا مقصد تھا، دہلی کی سلطنت بھی اسلامی سلطنت نہیں رہی، سید صاحبؒ کا نصب العین اور مقصد اس قدر واضح ہیں کہ ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں، جہاد کا ارادہ بھی کسی حزب کی تاسیس و تشکیل سے شروع نہیں ہوا، رام پور میں ولایتیوں سے مسلمانان پنجاب کی دردانگیز حالت سنی اور نیت اسی وقت مستحکم ہو گئی، (سوانح احمدی ص۱۲) رہا جہاد

وہجرت اور نصب امامت کا مقصد عالی تو اُسے خود انہی کی زبان سے سنئیے، سردار سلطان محمد خان اور سردار سعید محمد خان کو تحریر فرماتے ہیں:-

رب غیور کہ علیم بذات الصدور است آگاہ است بریں معنی کہ ایں جانب را از قبول ایں منصب غیر از اقامت جہاد بر وجہ مشروع و حصول معنی انتظام در عساکر اہل اسلام غرض دیگر از اغراض نفسانیہ ... ... نیست ... ... آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع اقطار عالم احکام رب العلمین کہ مسمی بشرع متین است بلا مشاورت (؟) احدے نافذ گردد ... (سیر سید احمد شہید ص ۱...)

رب غیور جو کہ دل کے حال سے اچھی طرح آگاہ ہے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ میری اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقہ پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو ... ... ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العلمین کے احکام جن کا نام شرع متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں۔

ہمیں کوئی بتلائے کہ دہلی کی حکومت کو کسی دور میں اس مقصد عالی سے کوئی دُور کا تعلق بھی رہا ہے؟

لے سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کے خطوط میں اس قسم کے بیانات اتنے واضح اور بے لاگ طریقے پر ہیں کہ ان میں کسی چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں، ان خطوط کا ایک معتد بہ حصہ سوانح احمدی کے آخر میں موجود ہے (ص ۲۴۳-۲۹۰) ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ مکاتیب کا اچھا خاصہ قیمتی ذخیرہ ابھی محفوظ ہے جن سے سیرت سید احمد شہیدؒ کے لائق مصنف نے فائدہ اُٹھایا ہے (منہ) مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو مزید اقتباسات دیئے جاتے ان بزرگوں کے بلند مقصد اور اسلامی روح کا اندازہ لگانے کے لئے صرف ان دو خطوں کا مطالعہ کافی ہوگا، جو سیرت سید شہیدؒ کے (صفحہ ۵۹۰) پر درج کئے گئے ہیں۔

سید صاحب کو ایک ضمنی حیثیت دے دینا تو آسان ہے، لیکن واقعات کی تکذیب بہت مشکل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد مولانا عبدالحی بڈھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) اور بھتیجے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) جن میں سے ہر ایک کا رتبہ خاندان ولی اللّٰہی میں مسلم ہے، سید صاحبؒ کے جاں نثاروں میں شامل تھے خدام کی طرح ان کی رکاب تھامے پھرتے تھے، (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۵۸-۲۱۵) اور اپنی جگہ پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحبؒ کے سلسلے اور خاندان میں ان دو بزرگوں کا مرتبہ مولانا شاہ محمد اسحٰق سے کہیں بڑھا ہوا ہے (سیرت سید احمد صفحہ ۲۱۵) اس کی پیش بندی مولانا کس طرح فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:-

"... ... مگر اس امارت کو تعلق کے لئے جس قدر تعلق شاہ ولی اللہ کی تحریک اور پھر شاہ عبدالعزیز کے کام سے تاریخی طور پر ہونا چاہیئے اس سے سید صاحب کوئی تعلق نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ ایک نئی تحریک شروع کردیں... ... اس نقص کے جبر کے لئے مولانا عبدالحی اور مولانا شہیدؒ ان کے ساتھ لگا دیئے گئے"۔ (صفحہ ۶)

اس بیان سے معاذ اللہ یہ شبہ ہوتا ہے، کہ شیخین کے ذمہ جاسوسی کی خدمت سپرد کی گئی تھی، کہاں کی بات کہاں پہنچتی ہے؟

اس جبر نقص کی مزید تشریح مولانا کے شاگرد اور اس کتاب کے مرتب و شارح[1]

---

[1] یہ کتاب اصل میں مولانا سندھی نے املا کرائی ہے اور علوی صاحب نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اسے مرتب کیا ہے، اور ساتھ ساتھ تشریحی حاشیے بڑھا دیئے ہیں۔ (دیباچہ کتاب)

مولوی نور الحق صاحب علوی کی زبان سے سنئے:۔

"امیر شہید دراصل اس حزب سے نہیں بلکہ بعد میں منسلک کئے گئے' ان میں کشفی کمالات تھے' سپاہ گری کی تعلیم تھی' سید تھے' اس لئے ان کو امام عبدالعزیزؒ نے امارت جہاد کے لئے موزوں قرار دیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حزب مذکور کی راہ سے نہ ہٹ جائیں' ان کے ساتھ دو وزیر اپنے مکمل تربیت یافتہ لگا دیئے' مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشیں حضرت شاہ اسحٰق کو مقرر کیا۔" (صفحہ ۱۴۳ [1])

آپ سمجھے یہ "نئی تحریک" کیا چیز ہے؟ اور "حزب مذکور کی راہ سے ہٹنا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کی تفسیر خود مولانا کی زبان سے سننے کے لائق ہے:۔

"اس طرح اس خاندان میں (یعنی حضرت سید شہیدؒ کے خاندان میں) حضرت مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہو گئیں' یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے' یہ خصوصیت' امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ سے متوارث چلی آتی ہے' بنا بریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پورے طور پر رنگا جانا بعید ہے یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا' اور تحریک نا کام رہ گئی۔"

---

[1] خط کشیدہ فقروں کے علاوہ ان سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے' اس کی صحت سے ہمیں انکار نہیں'

اچھا صاحب! سید صاحب نے تو موقع ملتے ہی "نئی تحریک" کھڑی کر دی اور اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا لیکن امام عبدالعزیز کے مقرر کردہ اور "مکمل تربیت یافتہ" وزیروں (مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ) کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے بھی بیعت کرلی، اور صرف بیعت ہی نہیں کی، بلکہ اس کے انعقاد اور تبلیغ میں اپنے شایان شان نمایاں حصہ بھی لیا (ملاحظہ ہو مولانا شہیدؒ کا مکتوب مندرجہ سیرت سید احمد شہیدؒ صفحہ ۱۶۱ - ۱۶۹) علاوہ بریں مولانا کے بیان کے مطابق امام عبدالعزیز نے "جمعیۃ مرکزیہ" کی مدد سے جو "نوجوان" "تیار کیے" ان میں "سرکردہ" "تین یا چار بزرگ تھے"، (۱) مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ (۲) مولانا عبدالحی دہلویؒ[1] (۳) مولانا محمد اسحٰقؒ (۴) مولانا محمد یعقوب (صفحہ ۱۱۴) اور یہ معلوم ہے کہ انعقاد بیعت کے اجماع (۱۲ ارجمادی الآخری ۱۲۴۲ھ سوانح احمدی صفحہ ۱۰۵/۱۰۱) میں مولانا شہیدؒ بہ نفس نفیس شریک تھے اور مولانا عبدالحی گو اس وقت موجود نہیں تھے، لیکن وہ سوات بنیر کے علاقہ میں سید صاحب سے جا کر مل گئے تھے (قبیل ذوالحجہ ۱۲۴۲ھ) اور ان کے جھنڈے کے نیچے برابر جہاد میں مصروف رہے اور یہ وابستگی آخر تک قائم رہی۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۳۲۲ ۳۱۵) اور جب انعقاد بیعت کی خبر مولانا اسحاق اور مولانا یعقوب کو ہندستان میں ملی تو وہ معترض نہیں ہوئے بلکہ برابر "اموال ورجال" سے امداد میں سرگرم رہے، اس طرح پر "جمعیۃ مرکزیہ" کی تربیت یافتہ" سرکردہ جماعت" کا سید صاحب کی امامت پر اجماع ثابت ہوتا ہے جس سے کوئی غیر جانب دار انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

---

[1] مولانا عبدالحی کی وفات شعبان ۱۲۴۳ھ میں ہوئی۔

رہی "تحریک کی ناکامی" سو اس کے دوسرے اسباب ہیں جن میں سردارانِ پشاور کی غداری اور سنگ دلی زیادہ اہم[1] ہے۔ خود مولانا بھی اس اجماع کو تسلیم کرتے ہیں، اور ساتھ ساتھ اسے "اختلافات کا منبع" بھی بتاتے جاتے ہیں:-

"۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیزؒ کا انتقال ہوا، اسی سال سید صاحب اور ان کے رفقا (مولانا اسمٰعیل و مولانا عبدالحی وغیرہ) نے ہجرت کا ارادہ کیا، ۱۲۴۲ھ میں سید صاحب کی امامت پر اجماع منعقد ہوا، اور وہی اختلاف کا منبع بن گیا۔" (صفحہ ۱۱۶)

دوسری جگہ اس "بیعت امامت" کو ان لوگوں کی "مداخلت" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو امام عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ نہ تھے:-

"یہاں یہ غلطی ہوئی کہ شاہ صاحبؒ کے فیصلے یعنی بورڈ کی حکمت کو نہ سمجھ کر سید صاحب کو امیر مطلق یعنی امام کے درجہ پر مان لیا گیا، اور یہ ان لوگوں کی مداخلت سے ہوا جو امام عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ نہ تھے، اس شکست میں اس اصولی تبدیلی کو بڑا دخل ہے۔" (صفحہ ۱۵۲)

خیر شکست کے اسباب تو دوسرے ہیں، یہاں ہمیں صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ حزب ولی اللہؒ کے خاص ارکان اور امام عبدالعزیزؒ کے تربیت کردہ "اصحاب" اور

---

[1] ناکامی کے اسباب کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے، ورنہ مضمون تبصرہ کی حد سے نکل کر ایک کتاب کی شکل اختیار کرلے گا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے رسالہ تجدید احیائے دین صفحہ ۱۲۰-۱۲۸ میں ناکامی کے اسباب پر مختصر لیکن اچھی تحقیقی بحث کی ہے، اسے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

سید صاحب کی جماعت میں "شیخین" کا رتبہ رکھنے والے بزرگوں کے ہوتے ہوئے دوسرے لوگوں کو "مداخلت" کا موقع کس طرح مل گیا؟ اور پھر صرف ان "وزیروں" پر بس نہیں "اُن" "ولی اللّٰہیوں" نے بھی سید شہیدؒ کے ہاتھ پہ بیعت کی جو میدانِ جہاد سے دُور، ہندستان میں تھے، خود مولانا کا بیان ہے:-

واستخلفه الامام عبد العزيز سنة ١٢٣١ه‍ (١٨١٦ء) لامامة الدعوة الى اتباع السُّنة والجهاد وجعل معه من العلماء مولانا عبد الحى الصدر السعيد مولانا اسمٰعيل الصدر الشهيد كالوزيرين وكان امرهم بالشورىٰ بينهم واذا اتفق الثلثة على شئ يكون مثل حكم الامام عبد العزيز (ص ۱۲۰)

امام عبد العزیز نے ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں سید صاحب کو اتباعِ سنت اور دعوتِ جہاد کی سربراہی (امامت) کے لئے اپنا جانشیں بنایا، اور علماء میں سے صدرِ حمید مولانا عبد الحی اور صدرِ شہید مولانا اسمٰعیلؒ وزیر کے طور پر ان کے ساتھ کر دیا، تمام اہم امور ان کے درمیان "شوریٰ" سے طے ہوتے تھے اس طرح پر کہ اگر تینوں کسی بات پر متفق ہو جائیں تو وہ امام عبد العزیز کا فیصلہ سمجھا جاتا۔

یہاں مولانا سندھی سے یہ خادم دریافت کر سکتا ہے کہ جب سید شہیدؒ کی بیعت امامت پر تینوں صاحبوں کا ("الثلثۃ" بقول سید صاحبؒ) اتفاق ہو گیا تھا تو پھر امام عبد العزیز کا فیصلہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

ابھی سلسلۂ بیان جاری ہے:-

واقاموا حكومة موقتة كان اميرها السيد احمد فى ١٢ جمادى الاخرىٰ ١٢٤٢ه‍ (١٠ نومبر ١٨٢٦ء) وبايع الافاغنة

اور ان لوگوں نے ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۰ نومبر ۱۸۲۶ء) کو ایک حکومتِ موقتہ قائم کر لی جس کے امیر سید احمد تھے اور اکثر افاغنہ نے

نوٹ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

اکثرھم بامامۃ الامیر۔۔۔ وکذالک بایع امامۃ الامیر من کان من الولی اللّٰھیین بالھند وکانوا یمدونھم بالاموال والرجال (ص۱۲۳ بحوالہ کتاب التمہید)	امیر کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی نیز امیر کی امامت کی بیعت ان ولی اللّٰہیوں نے بھی کی جو ہندستان میں رہ گئے تھے اور وہ مجاہدین کی آدمی اور روپے سے مدد کرتے رہتے تھے (ص۱۴۵)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید شہیدؒ کی امامت پر وقت کے تمام ولی اللّٰہیوں کا اتفاق ہو گیا تھا اور خود مولانا محمد اسحٰق صاحب بھی یقینی اس میں شریک ہوں گے آخر وہ ولی اللّٰہیوں سے خارج تو تھے نہیں لیکن مولانا کو تو اپنا نظریہ پیش کرنا ہے خواہ واقعات سے تائید نہ ہوتی ہو اس لیے کتاب التمہید کے اس بے لاگ بیان کے ساتھ چند فقرے اپنے مطلب کے بھی چسپاں کئے گئے۔

وھذا الامر کان مرکزہ داوتہ الدھلی (کذا) وکان الصدر المجیبین مولانا محمد اسحٰق مدیرا لہا	اس کا مرکزی دفتر دہلی تھا اور مولانا محمد اسحٰق اس کے ڈائرکٹر تھے۔

اصل میں "ہذا الامر" کا فقرہ ہے اس سے اگر مراد امامت اور نصب امارت کی قوت یا "قیادت علیا" مراد ہے تو وہ دہلی میں کیسے ہو سکتی ہے؟ امیر منتخب میدان

[گذشتہ صفحہ کا حاشیہ] ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے دوسری اسی کتاب میں (ص۱۵۰) تقریباً یہی صحیح تاریخ دی گئی ہے (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) قمری مہینوں کی مطابقت میں ایک دن کا اختلاف ہو سکتا ہے ہمارے سامنے اس وقت انجمن ترقی اردو (دہلی) کی مرتب کردہ جنتری (تقویم ہجری و عیسوی) ہے۔

جہاد میں موجود ہے، اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے خواص وعوام کے ساتھ امام عبد العزیز کے مقرر کردہ وزیر بھی ہیں، ان ہی تینوں بزرگوں کا نام مولانا نے "بورڈ" لکھا ہے، اس کے بعد دہلی یا میدانِ جہاد سے دور رہنے والے بزرگ صرف آدمی اور روپیے (الاموال والرجال) سے مدد کر سکتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شاہ محمد اسحٰق اس میں سرگرم تھے، اور ہو سکتا ہے کہ اس تنظیم کا بار ان ہی کے کندھے پر ہو۔[1]

اس حقیقت کو مولانا نے خود بھی ایک دوسری جگہ صاف طور پر بیان کیا ہے، عربی دنیا سے اسلامی ہند کی اس اسلامی تحریک کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

النهضة التي قام بها الامام عبد العزيز	امام عبد العزیز کے ہاتھوں جو تحریک اٹھی وہ آگے
الدهلوي ارتقت من سنة ۱۲۴۲ الى	چل کر ۱۲۴۲ھ سے سرحدی علاقوں میں ایک
الحكومة الموقتة الهندية في جبال	حکومت موقتہ ہندیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، اس
الافغانيين من حدود الهند	شرعی حکومت کے صدر امیر المومنین سید احمد دہلوی
ورئيس تلك الحكومة الشرعية كان	(یہ بریلوی) (امیر شہید) تھے اور صدارت عظمیٰ کا عہدہ
امير المومنين السيد احمد الدهلوي[2]	مولانا عبد الحی دہلوی (بڈھانوی) (قدس سرہما

---

[1] مولانا نے بار بار زور دیا ہے کہ "مولانا محمد اسحٰق کے ہاتھوں میں روپیہ روانہ کرنے کا انتظام تھا" (ص ۳-۱۱۱) ہمیں اس کے ماننے میں ادنیٰ تامل نہیں، اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شاہ محمد اسحٰق جماعت مجاہدین اور امیر کی اعانت میں سرگرم تھے، رہا یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا اسحٰق ہی جزو وکل تھے اور سید شہید ان کے کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں۔ [2] پتہ نہیں سید شہید کو دہلوی کس طرح لکھ دیا گیا؟

(۶)، (الامیر الشہید)، وصدارة وزرائها تستند الی مولانا عبد الحی الدهلوی (ر؟)، (الصدر السعید)، والامور الحربیة والسیاسیة کانت موکولة الی مولانا محمد اسمٰعیل الدهلوی (الصدر الشهید)، واما الامور التی تشبه الداخلیة من جمع الاموال وحشد الرجال وغیرهما فکان وکیلها فی الدهلی (کذا) مولانا محمد اسحاق (الصدر الحمید) (صفحہ ۱۷۵-۱۷۳ ! بحوالہ مقدمہ المسوی مطبوعہ مکہ مکرمہ)

کے سپرد تھا، اور امور حربیہ وسیاسیہ کی سربراہی مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی (صدر شہید) کے ذمہ تھی، باقی رہے وہ امور جو وزارت داخلیہ کے منصب سے مشابہ ہیں، جیسے آدمی اور روپیے کی فراہمی وغیرہ، تو ان کے وکیل دہلی میں مولانا محمد اسحاق (صدر حمید) تھے۔ .. ..

.. ..

.. .. ..

.. ..

ہمارا خیال ہے کہ مولانا کا یہ بیان اس باب میں فیصلہ کن ہے، رئیس حکومت اور وکیل داخلیہ کے مراتب میں جو فرق ہے، وہی سید شہیدؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے درمیان ملحوظ رکھنا چاہیئے، اور یہ ان بزرگوں کے باہمی "فرق مراتب" کے متعلق عرض کیا جا رہا ہے، ورنہ ہمارے لئے سب لائق احترام وعقیدت ہیں۔

(گذشتہ حاشیہ کا بقیہ) ممکن کتابت یا طباعت کی غلطی ہو، مولانا عبدالحی بڈھانوی کو شاید قرابت کے باعث دہلوی لکھا گیا ہو۔

ایں سلسلہ طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

اور حاشا کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی کسی کے ساتھ سوء ادب کا ادنیٰ شائبہ آیا ہو، اعاذنا اللہ من ذٰلک وکفیٰ بہٖ علیماً.

سید شہیدؒ اور مولانا محمد اسحاق کے درمیان کیا فرق مراتب تھا، اور یہ کہ شاہ اسحاق صاحبؒ، سید صاحبؒ کی مالی امداد میں کس قدر سرگرم تھے، اس کا اندازہ خود حضرت سید شہید کے ایک مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو میدان جہاد سے مولانا محمد اسحٰق کے نام تحریر کیا گیا تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، از امیرالمومنین سید احمد، بخدمت بابرکت صاحبزادۂ والا تبار مولانا محمد اسحاق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد از سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح آنکہ بتاریخ دہم ماہ رمضان ہنڈوی مبلغ ہفت ہزار و صد و پنجاہ روپیہ رسید، لیکن بجز پرچہ کاغذ یک خر مہرہ ہم نہ رسید، موجبش دریافت نیست، لازم کہ سبب تعویق آں برآں برنگارند، زیادہ والسلام مع الاکرام

(سوانح احمدی ص ۲۳۵)

کیا سید صاحبؒ کے مرتبے کا آدمی خواہ "کشفی قوت" کا حامل ہو، اپنے مطاع اور سردار کو صاحبزادہ والا تبار سے خطاب کر سکتا ہے؟

اب ہم انتہائی رنج و قلق کے ساتھ مولانا سندھی کی کتاب سے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ سید صاحبؒ اور ان کے خاص ماننے والوں پر "کمپنی بہادر" سے ساز باز کا الزام لگایا ہے،

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ۔ یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ہاں! تو مولانا فرماتے ہیں :-

"......... لہٰذا سید صاحب اور ان کے مجاہدین کو دلّی کے مرکز کے تابع ہو کر کام کرنا چاہیئے تھا، ان کو روپیہ اور آدمی دہلی سے بھیجے جاتے ہیں، یعنی سارا مقصد دلی کی آزادی کو مستحکم بنانا تھا، مگر اب سید صاحب خلیفہ کہلانے لگے اور ساری دنیا کے ایک بڑے امیر بن گئے، یعنی اگر افغان سرداروں کے لیے ان کی اطاعت مذہبی فرض ہے تو بخارا، ترکی، دوسرے ممالک بھی ان کی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے...... امیر شہید کو اس طرح امام مہدی کے درجہ کے قریب لانے کی کوشش کی گئی، اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی، ہمارے خیال میں اس تمام تر تغیر میں کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چال کو بڑا دخل ہے۔"

(ص ۹-۱۵۸، حاشیہ)

اس مختصر سی عبارت میں ایسی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں، جن کا مولانا کے دماغ کے سوا کہیں وجود نہیں،

(الف) سید صاحب کا مقصد دہلی کی حکومت کو مستحکم بنانا کبھی نہیں رہا، سید شہیدؒ اور مولانا شہیدؒ کے مکاتیب اور بیانات اس باب میں روز روشن کی طرح نمایاں ہیں، کہاں دلّی کی حکومت، اور کہاں تمام اقطار عالم میں احکام رب العالمین کے اجرا کا عزم بلند.

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار ۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

"دلّی کی حکومت" کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے،

(ب) سید صاحبؒ یا ان کے ماننے والوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ تمام دنیائے اسلام کے امام مطلق تھے، البتہ سرحد کے قیام اور دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں سے حلقۂ نفوذ میں وسعت ضرور ہو رہی تھی

(ج) "امام مہدی" کے قریب لانے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی، یہ مولانا کا انتہائی مبالغہ ہے۔

(د) "اس سے مرکز یعنی دلی کی حکومت جاتی رہی"

گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۸۲۲ء اور ۱۸۶۶ء کے دوران میں مرکزی حکومت کی کچھ اہمیت باقی رہ گئی تھی؟ اہل علم بتائیں کہ یہ بیان کہاں تک حقیقت سے تعلق رکھتا ہے؟ تاریخ تو ہمیں بتاتی ہے کہ دلی کی مرکزیت شاہ عالم (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء - ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) ہی کے زمانہ میں ختم ہو چکی تھی، اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء - ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) کے دور میں تو دلّی کی حکومت بالکل برائے نام رہ گئی تھی، اور لال قلعہ کی وقعت ایک امیر کی حویلی سے زیادہ نہیں تھی،

(ہ) یہ سب باتیں تو غلط تھیں ہی، لیکن مولانا کا در پردہ یہ فرمانا کہ "مجاہدین کو کمپنی بہادر نے استعمال کیا" یا یہ کہ سید صاحب کی امامت اور بیعت میں کمپنی بہادر کو دخل تھا، سراسر بہتان ہے، آخر" اس تمام "تعبیر" سے مولانا کی مراد ہو کیا سکتی ہے؟ سید صاحب کا دلی کے مرکز کے تابع نہ ہونا، یا ان کا امیر المومنین منتخب ہونا، اس کے علاوہ تو اور کوئی بات اوپر نہیں کہی گئی ہے، اللہ جانتا ہے، اور مولانا اس حقیر سے زیادہ بہتر جانتے ہیں، کہ اس بیعت اور اجتماع میں کمپنی بہادر کو ادنیٰ دخل بھی نہیں

تھا، سچی بات یہ ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے سرفروش مجاہدوں پر اس سے زیادہ اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ مولانا نے آخر ایسی بات کہی کیوں کر؟ تو اس کے متعلق بھی صاف صاف عرض کر دوں، بہت سی باتیں ہر موقع پر نہیں کہی جاتیں مگر اب وقت آگیا ہے، تو سن لیجئے۔ کمپنی بہادر کی چال صرف اتنی تھی کہ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) سے ۱۲۴۶ھ تک اور پھر سید صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے بعد بھی الحاق پنجاب (۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) تک اس نے آدمی اور روپے کی فراہمی میں کوئی روک ٹوک نہیں کی، ہنٹر لکھتا ہے کہ بعض کارخانوں کے مسلمان ملازمین چھٹی لے کر جہاد کو جایا کرتے تھے، مولانا محمد اسحاق کو ایک مہاجن سے جہادیوں کی امدادی رقم جو اس نے غبن کر لی تھی، عدالت سے دلوائی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ مجاہدوں اور سکھوں کی معرکہ آرائی میں کچھ سرکار عالی کا فائدہ ہی ہو رہے گا۔ لیکن جونہی پنجاب کا الحاق ہوا (۱۸۴۹ء)، کمپنی اور سرکار کی نگاہ میں مجاہدین سے برا کوئی نہیں تھا، اور پھر کوئی کسر نہیں تھی، جو انہیں کچلنے کے لیے اٹھا رکھی گئی ہو، اور یہی سخت جان لوگ

لہ Sir Syad Ahmad on Dr. Hunters our Indian Mussalmans مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء The Indian Musalmans ص ۲۱ - ۲۲، لہ اب اگر سکھوں اور مجاہدین ہند کی باہمی معرکہ آرائی سے واقعی کمپنی بہادر کو کچھ فائدہ پہنچا تو اس کا الزام سکھوں اور ان کی ظالمانہ روش پر عائد ہوتا ہے۔

تھے، جو اِن حالات میں چالیس سال تک حکومت کا مقابلہ کرتے رہے۔

یہ ہے مولانا کے الزام کی حقیقت جو صاف صاف بیان کر دی گئی، لیکن مولانا اسی الزام کو دوسری جگہ اس طرح دُہراتے ہیں، کہ اس کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، وہ سید صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے جاں نثاروں کو کمپنی بہادر کا آلہ کار بتاتے ہیں، اگر کوئی دوسرا اس قسم کی بے بنیاد بات کہتا تو اس کی ناواقفیت اور تعصب پر محمول کر کے صبر کر لیتے، لیکن اگر سید شہیدؒ کے اصحاب خاص پر مولانا سندھی کمپنی سے ساز باز کا الزام لگائیں تو بتائیے کہ صبر کے لئے پتھر کا کلیجہ کہاں سے لایا جائے۔ فالی اللہ المشتکی،

"...... فکان (کانت) الحرب بینھم وبین المتغلبین علی مسلمی المفنجاب (: فنجاب) سجال (: سجالًا) حتی انزھش منھم امراء الجمعیة التجاریة الانکلیزیة فاستعانوا بالمسلمین المخالفین للولی اللھیین

تو مجاہدین اور مسلمانانِ پنجاب کے خود ساختہ ظالم حاکموں کے درمیان لڑائی برابر کی رہی، تا آنکہ کمپنی بہادر کے اہل کاروں کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی، اس لیے انہوں نے ان مسلمانوں سے کام لیا، جو ولی اللّٰہیوں کے مخالف تھے، اور ان کی زد میں آئے ہوئے

۱؎ ملاحظہ ہو: (۱) سیرت سید احمد شہید باب چہارم (۲) تواریخ عجیب (مولوی محمد جعفر تھانیسری) (۳) تذکرہ صادقہ (مولانا عبدالرحیم صادق پوری) (۴) ہنٹر کی The Indian Mussalmans (۵) ٹیلر (Taylor) کی Thirty Eight years in India وغیرہ وغیرہ۔

وأمدّوهم بالاموال فوصلوا الى بلاد الافاغنة فاوقعوا الشقاق بين الهنديين المهاجرين وبين الافاغنة الوطنيين

(ص ۱۴۸ بحوالہ کتاب التمہید)

امداد کی، تو یہ لوگ افغانوں کے ملک میں آئے، اور انہوں نے ہندی مہاجرین اور ملکی افغانوں کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی،

آپ سمجھے یہ سرکاری کمپنی کے آلہ کار کون تھے؟ بڑے بڑے عالم، متبع سنت جہاد کے شیدائی، شوکانی اور مولانا شہیدؒ کے شاگرد، اور پھر ان پر یہ الزام کیوں تراشا گیا، اس لئے کہ وہ حنفی نہیں تھے، ائمہ حدیث کے مسالک کے مطابق رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے، اور مولانا کے خیال میں ولی اللہیوں کے مخالف تھے، ہمارے وہم میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ حنفیت کی عصبیت ایک وسیع النظر عالم کو ایسی غلط بیانیوں پر آمادہ کر سکتی ہے؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ سید صاحبؒ معصوم تھے، یا ان کے سرفروش اہل حدیث جاں نثاروں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ان میں سے گرم لوگوں نے افغانی علاقہ میں عمل بالحدیث پر اصرار کر کے (اگر یہ واقعہ ہے) مصلحت شناسی کا ثبوت دیا، لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں، اور پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ سید صاحبؒ اور ان کی جماعت کے مخصوص اور با اثر اصحاب کا دامن کسی اجنبی حکومت کے ساتھ ساز باز سے یکسر پاک رہا ہے۔

لے مولانا سندھی اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۳ء میں اس "تنقید" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں
"ہمارا یہ فقرہ "کمپنی کی ڈپلومیٹک سازش" آپ غلط محل پر لے گئے۔ اس قدر بدگمانی نہ کرتے تو اچھا ہوتا

ہندستان کے عاملین بالحدیث سے مولانا بہت رنجیدہ ہیں، اس پر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ ابھی تو سید صاحبؒ ہی پر اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے:۔

"ہندستانی انقلاب کی جو خصوصیت اس تحریک کے ذاتیات میں داخل تھی، وہ تقیید" کمزور ہوتی گئی۔ یعنی ماورائے سندھ کو مرکز مستقل بنا کر دہلی سے سرکشی اور بغاوت کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حزب ولی اللہ کی حکومت کا طریقہ بورڈ کی حکومت سے شخصی امامت (ڈکٹیٹر شپ) میں تبدیل ہوگیا، اس طرح امیر شہید امیر المومنین اور دنیائے اسلام کے مسلّم خلیفہ مانے گئے۔" (ص ۱۵۸-۹)

ان "طنزیات" کے نمونے اوپر گذر چکے ہیں، البتہ سرکشی اور بغاوت کے میٹھے بول قابل توجہ ہیں، رہی ڈکٹیٹر شپ اور شخصی امامت، تو یہ سید صاحبؒ اور ان وزیر شہیدؒ کی اپنی ایجاد نہیں، اگر یہ ایسی ہی ناقابل اور گردن زدنی

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ مقصود تھا جو مولانا حمید الدین مرحوم سے ہم نے سنا تھا کہ ان کے اطراف کے کوئی ملازم پیشہ سرحد میں گئے۔ اور مجاہدین اور افغانوں میں نفاق کا بیج بو آئے، مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ مجاہدین مع اپنے سرداروں کے شہید ہوگئے تو وہ اپنے آپ کو اُلٹا بندھواتے اور کوڑوں سے پٹواتے، یہ عمل وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مسلسل جاری رکھتے رہے۔ —— اب ناظرین خود فرمائیں کہ مولانا حمید الدین مرحوم کے بیان کردہ واقعہ سے اس الزام کو کوئی دور کی بھی مناسبت ہے؟ اصل یہ ہے کہ اپنی مطلب براری کے لئے ت کا بتنگڑ بنانا مولانا کا خاص فن ہے، کہاں ایک شاذ" واقعہ اور کہاں پوری جماعت پر ساز باز کا عام

چیز ہے تو پھر سید صاحبؒ نے کون سا قصور کیا ہے؟ خلافت راشدہ اور شیخین رضی اللہ عنہما ہی کو ہدف ملامت بنانا چاہئے۔ باقی "امیر المومنین" اور "مصلح خلیفہ" کے طعنے تو افسوس کہ یہ "شیخ الہند کے شاگرد اور "حکمت ولی اللٰہی" کے شارح ومفسر کی زبان سے اچھے نہیں معلوم ہوتے، ہم نیازمندوں کی کیا مجال کہ جواب میں کچھ عرض کر سکیں،

قومی ھم قتلوا امیم اخی　　　فاذا رمیت یصیبنی سھمی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی "ڈکٹیٹرشپ" اور "امارت مطلقہ" کی توجیہ مولانا نے ایک اور توجیہ پیش کی ہے:-

"اس کے بعد (جہاد کی بیعت کے بعد) ایک سال تک مولانا عبدالحی (ف ۱۲۴۳ھ) زندہ رہے ان کی موجودگی میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا، سید احمد شہید ان کے سامنے اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے، بلکہ اجتماعی فیصلہ حکومت کر رہا تھا۔" (ص ۱۵۶)

اگر سید صاحبؒ کسی مسئلے میں بھی اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے، تو ان کی بیعت پر اجماع ایک لغو فعل تھا، اور مولانا عبدالحیؒ نے بیعت کرنے میں سخت غلطی کی تھی، اسلام میں شوریٰ کی تاکید ضرور ہے لیکن امام ہر حال میں مجلس شوریٰ کی رائے کا پابند نہیں، کیا مولانا عبدالحیؒ بڈھانوی سا عالم متبحر اتنی سادہ حقیقت بھی نہیں جانتا تھا؟ سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی اس قسم کی توجیہوں

۱؎ خود شاہ عبدالعزیز صاحبؒ انھیں "شیخ الاسلام" کے لقب سے یاد کرتے تھے (سیرت سید احمد شہید ص ۳۱۵)

کی زد صرف سید صاحبؒ ہی پر نہیں، بلکہ ان کے حزب ولی اللہی کے خاص ارکان پر بھی پڑتی ہے"

اور مولانا عبدالحیٰؒ کے اس اثر ونفوذ کی تائید میں حسبِ ذیل قصہ دہرایا گیا ہے:۔

"سید احمد شہید ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں آکر شریک ہوئے نماز سے فارغ ہو کر مولانا عبدالحیٰؒ نے "ما بال اقوام" الخ کے طور پر فرمایا کہ ایسے لوگ جو سنت کے احیاء کے مدعی ہیں، وہ جماعت میں بھی صحیح طور پر حاضر نہیں ہو سکتے! سید صاحب نے فرمایا، مولانا! آپ کا یہ ارشاد حق ہے، اور ہم سے پھر ایسی کوتاہی نہیں ہوگی، اور یہ آپکا فرض ہے کہ آپ اس طرح ٹوکیں، مولانا عبدالحیٰ نے کہا کہ یہ عذر صحیح نہیں ہے۔ آپ کو صحیح طور پر کام کرنا چاہیئے ہر روز کون ٹوک سکتا ہے؟ امام بنتے ہو تو آگے بڑھ کر کام کرو" ؎۱

پہلے اس قصہ کے آخری فقروں کا تیور ملاحظہ ہو، اس کے بعد مصنف سیرت سید احمد شہید کا یہ بیان جو اپنی جگہ پر کافی وشافی ہے:۔

"سید صاحبؒ کی جماعت میں آپ کی وہ حیثیت تھی، جو بلاتشبیہ صحابۂ کرام میں حضرت صدیق اکبرؓ کی، آپ پر شان صدیقیت اور شاہ صاحبؒ پر شان فاروقی غالب تھی، .... امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نہایت چست ومستعد رہتے، اور اس میں اپنے شیخ کا بھی، جس سے زیادہ محترم ہستی آپ کی نظر میں کوئی نہ تھی، لحاظ نہ کرتے، ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحبؒ

؎۱ اصل میں فقرے خط کشیدہ نہیں۔

کو خلاف معمول جماعت میں کچھ تاخیر ہو گئی، دوسرے دن پھر اتنی تاخیر ہوئی کہ تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی۔ مولانا نے سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ عبادت الٰہی ہو گی یا شادی کی عشرت؟ سید صاحب خاموش ہو گئے، اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی۔ اسی دن مولانا عبد الحی نے اسی کا وعظ فرمایا، ایک مرتبہ سید صاحب نے فرمایا کہ اگر مجھ سے کوئی بات خلاف سنت دیکھئے متنبہ کر دیجئے گا، مولانا نے فرمایا، کہ حضرت! جب کوئی مخالف سنت فعل آپ سے عبد الحی دیکھے گا تو وہ آپ کے ساتھ ہو گا ہی کہاں!........ (صفحہ ۳۱۶۔ طبع دوم)

اوپر مولانا ابو الحسن علی حسنی نے بھی مولانا عبد الحی کے احتساب کے تین واقعے بیان کیے، لیکن کہیں وہ تلخی نہیں، جو مولانا سندھی کی روایت میں ملتی ہے، اور پھر یہی کی تلخی، مندرجہ ذیل واقعہ پڑھ کر اور بھی بعید معلوم ہوتی ہے، مولانا سندھی کی روایت ہے[۱]:۔

"جب مولنا عبد الحی کا آخری وقت تھا، تو سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ مولانا! آپ کی اگر کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کر دوں، آپ نے کہا آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھیں، یہی ایک خواہش باقی ہے"

---

[۱] یہ ہر دو واقعے ہیں، مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے سنائے، غالباً انہوں نے مولانا محمد قاسم یا مولانا رشید احمدؒ سے سُنے ہوں گے۔ (صفحہ ۱۵۸ حاشیہ)

سید صاحب نے اس کی تعمیل کر دی، الغرض ادب بھی انتہا درجہ کا ملحوظ ہے، اور ان کو قاعدے کے اندر پابند رکھنے کی قوت بھی ہے"۔

(حاشیہ ص ۱۵۸)

اب یہی واقعہ سید صاحبؒ کے مستند سیرت نگار کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

"انتقال کے وقت سید صاحبؒ سے فرمایا کہ حضرت شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی، اب اتنی تمنا ہے کہ آپ اپنا قدم مبارک میرے سینہ پر رکھ دیجیے کہ اسی حالت میں میری جان نکل جائے، سید صاحب نے فرمایا کہ میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ اس سینہ پر رکھوں جو قرآن و حدیث کے علم کا خزینہ ہے، آپ نے تسلی کے لئے اپنا ہاتھ آپ کے سینہ پر رکھ دیا، اور اسی حالت میں آپ کا انتقال ہو گیا"۔

(سیرت سید احمد شہید ص ۲۴۴)

دیکھئے دونوں روایتوں کی زبان میں کتنا فرق ہے؟ بہرحال ہمیں ان روایتوں کی صحت سے انکار نہیں (البتہ مولانا سندھی کی روایت میں بعض فقرے بعید معلوم ہوتے ہیں) لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا عبدالحی کی وفات کے بعد سید صاحبؒ بے قابو ہو گئے، بالکل غلط ہے۔ آخر مولانا شہیدؒ تو آخری لمحہ حیات تک ساتھ ہی رہے، (جن پر بقول ابوالحسن علی شان فاروقیت غالب تھی)۔

مولانا ایک طرف تو سید صاحبؒ کی امارت و امامت سے برہم ہیں (جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا)، دوسری طرف انعقاد بیعت کی تاریخ کو وہ "شمسی قومی نوروز" بھی منانا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"۱۲۴۱ھ میں ہجرت شروع ہوئی، اور ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی قبائل نے بھی ہنڈ میں سید احمد کو اپنا امیر مان لیا" (ص ۱۵۶)

ہنڈ پر حاشیہ میں لکھتے ہیں :-

" ہنڈ کا تعلق ہماری سیاسی تاریخ سے نہایت قوی ہے، یہ ہنڈ وہی مقام ہے جہاں ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ کو "فرقہ ولی اللّٰہیہ" کے مقدمۃ الجیوش نے جسے امام عبد العزیز دہلوی نے تیار کیا تھا، اپنی حکومت موقتہ قائم کی، اس کے رئیس امیر شہید دہلوی (؟ بریلوی) تھے جمہور مسلمین نے بیعت کی، اور انہیں امیر مان لیا گیا، اتفاق سے یہ تاریخ ۱۰ جنوری[1] ۱۸۲۷ء کے موافق تھی۔ اس لئے ہمارا شمسی قومی نوروز اس واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ۱۰ جنوری کو منایا جائے گا۔ جس قدر ہندستانی مسلمانوں کی قومی روح پیدا ہوگی، اسی انداز سے وہ ہماری تجویز کی تائید کریں گے"۔ (ص ۱۵۷)

اس ارشاد گرامی کا خلاصہ ان دفعات میں کیا جا سکتا ہے :-

(۱) سید صاحبؒ کی امارت مان لی گئی،

---

[1] ہم ابھی اوپر لکھ آئے ہیں کہ ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے (تقویم ہجری وعیسوی) سیرت نگاروں نے دن کی تعیین نہیں کی، اس لئے یقین کے ساتھ ان دونوں تاریخوں میں کسی ایک کو ترجیح نہیں دی جا سکتی قمری مہینوں کی مطابقت میں یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) انعقادِ بیعت کی تاریخ نہایت اہم بالشان اور وہ دن ایک تاریخی دن ہے،

(۳) شمسی قومی نوروز منایا جائے۔

(۴) ہندستانی مسلمانوں میں قومی روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

کاش! مولانا ہمیں بتاتے کہ امام ولی اللہؒ نے کس کتاب میں شمسی قومی نوروز منانے کی تلقین کی ہے، یا اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے؟ دوسری بات یہ عرض کرنا تھی کہ سید صاحبؒ کی "امارت مطلقہ" (یعنی اندرونِ ہند کی نگرانی سے آزاد) غلط تھی، پھر ان کے انعقادِ بیعت کا دن اتنا اہم کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟

باقی "نیشنلزم" کے متعلق تو مولانا کا خیال واضح ہو چکا ہے، اس لئے کچھ مزید عرض کرنا بے سود ہے، رہا ایک مسلمان کا نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہیئے؟ تو اسے عارف رومی کے خیال کو انہی کی زبان سے یوں ادا کر سکتے ہیں۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (اقبال)

اس سلسلے کی ایک اور بات رہ گئی، امام عبدالعزیز (ف ۱۲۳۹ھ) کے بعد مسندِ درس کی جانشینی مولانا محمد اسحٰق کو تفویض ہوئی، اس سے مولانا نے شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کی امارتِ مطلقہ پر استدلال کیا ہے۔ حالانکہ اس سے

مولانا فرماتے ہیں:- امام عبدالعزیزؒ نے سید احمد شہیدؒ کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعت طریقت کے لئے اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ میں بیعت جہاد لینے کے لئے دورہ پر بھیجا، اس کے بعد سارے جماعت سمیت حج پر جانے کا حکم دیا، تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہو جائے، جب قافلہ حج سے ۱۲۳۹ھ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مدعا ثابت نہیں ہوتا، جب سید صاحبؒ کی امامت پر ہندستان اور ماوراء سرحد کے تمام مجاہدوں اور ولی اللہیوں نے بیعت کرلی، اور شاہ اسحاق صاحبؒ نے اس پر اعتراض نہیں کیا، بلکہ برابر آدمی اور روپے سے مدد کرتے رہے، تو ان کی حیثیت اندرونی ناظم اور وکیل سے زیادہ نہیں رہ جاتی، جیسا کہ خود مولانا کتاب التمہید میں اعتراف کرچکے ہیں، رہا "مدرسہ کا سپرد کیا جانا" تو اس کی حیثیت ایک مقامی ضرورت کی انجام دہی سے زیادہ نہیں ہے، (اور بقول حضرت مولانا ابوالکلام مدظلہٗ مدرسوں اور حجروں کا کام تو ہر کوئی کرلیتا ہے لیکن "میدان والا معاملہ کم لوگوں سے بن آتا ہے"، اس سے شاہ محمد اسحاق صاحب کا علمی مرتبہ ضرور معلوم ہوتا ہے جس میں کسی چون وچرا کی گنجایش نہیں، اور اگر صرف مسند درس کی جانشینی، امارت وامامت پر دلالت کرتی ہے تو مولانا کیا فرمائیں گے، میاں صاحب مولانا سید نذیر حسین محدثؒ (سورج گڈھی مونگیری) دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء) کی امامت کے بارے میں؟ شاہ محمد اسحاق صاحب کی ہجرت (شوال ۱۲۵۸ھ) کے بعد میاں صاحب ہی جانشیں ہوئے اور انہوں نے مسلسل ایک عرصۂ دراز تک مسند ولی اللّٰہی پر درس دینے کی عزت حاصل کی، پھر آپ شاہ اسحاقؒ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) میں واپس آیا تو امام عبدالعزیز فوت ہوچکے تھے، انہوں نے آخری وقت میں مولانا محمد اسحق کو مدرسہ سپرد کرکے اپنا قائم مقام بنادیا تھا (ص ۱۵۳)، لہ مولانا شاہ صاحبؒ مدرسہ کو ولی اللہ کالج کہنا پسند کرتے ہیں (حاشیہ ص ۱۳۴ ص ۲۷)، پتہ نہیں کالج کے لفظ میں کیا جادو ہے؟ کہ ہمارے اکابر بھی اس سے مسحور ہو گئے (برطکرد ص ۴۴ حاشیہ)، شاہ محمد اسحاق صاحب (ف ۱۲۶۲ھ) کی ہجرت (۱۲۵۸ھ الحیات بعد الممات ص ۵۳) کے بعد میاں صاحب کی جانشینی کا تذکرہ بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے۔ جانے کیوں مولانا اہل حدیث عالموں سے اتنے بیزار

صاحب کے بعد امارت اور اپنے حزب اللہی کی قیادت حاجی امداد اللہ صاحب (ف ۱۳۱۷ھ) کو کیوں سونپتے ہیں؟ گویا آپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ مسند درس کی جانشینی حزب کی امامت وامارت کے لئے کافی نہیں۔

سید شہیدؒ کے ساتھ مولانا ان کے تذکرہ نگاروں اور ثنا خوانوں سے بھی برہم ہیں، جس کا کوئی شکوہ نہیں، البتہ رنج اس بات کا ہے کہ کہیں کہیں ان مخلصوں پر بیجا حملے کئے گئے ہیں، صے میں مولانا نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مشہور خواب کا ذکر کیا ہے، اور شارح نے کتاب التمہید کی عبارت کے ساتھ سیرت احمد شہید (ص ۶۴، طبع دوم) سے بھی مندرجۂ ذیل سطریں نقل کی ہیں:-

"صبح اٹھ کر شاہ صاحب سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی مظہری خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور خواب کی تعبیر چاہی، شاہ غلام علی نے فرمایا ...... کہ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے (یا آپ کے کسی مرید رشید) کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وفیض کا سلسلہ جاری ہوگا۔ الخ"

اس کے بعد شارح مولوی نورالحق صاحب علوی فرماتے ہیں:-

"مولانا الشیخ عم فیضہم نے مجھ سے ۲۶ جون ۱۹۶۰ء کو فرمایا کہ یہ خواب امام عبدالعزیز کی عظمت پر دال ہے کہ ان کے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی بغیر آپ کے ممکن نہ تھی، رہا فقرہ محصور بین الخطین

ؔ سیرت سید احمد شہید میں یہ فقرہ بین الخطین نہیں ہے، (طبع دوم ص ۶۴، طبع اول ص ۸۰)

ہمارا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علیؒ کے ذمہ لگا کر محض اس لئے بڑھایا گیا کہ سید امیر شہید کی فضیلت ثابت کی جاسکے، ورنہ اصل خواب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔"

آپ نے دیکھا پہلے" یا آپ کے کسی مرید رشید" والے فقرے کو بین الخطین کیا گیا، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ فقرہ محصور بین الخطین بعد کا اضافہ ہے۔ سبحان اللہ!! اعتراض کی کیا دلچسپ صورت نکالی گئی ہے۔ "خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" شاید اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فقرہ مذکورہ بعد کا اضافہ نہیں ہے۔ سیرت سید احمد شہید کے مصنف نے یہ واقعہ غالباً مخزن احمدی سے لیا۔ جو سید صاحبؒ کے بڑے بھانجے (اور ان سے عمر میں بڑے) ان کے خلیفہ اور رفیق سفر، مولوی سید محمد علی صاحب (ف ۱۲۶۶ھ) کی تصنیف ہے (سال تصنیف ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء) بہرحال انھوں نے جہاں سے بھی لیا ہو، یہ واقعہ مخزن احمدی میں بعینہ مذکور ہے، جو سید صاحبؒ کے ابتدائی حالات میں سب سے بڑا ماخذ ہے، ملاحظہ ہو:

"...... صبح گاہاں امام المحدثین بملاقات حضرت سید غلام علی صاحب کہ از خلفائے حضرت شمس الدین شہید کہ مشہور بہ مرزا مظہر مرحوم اند رفتہ ایں رویا بیان نمودہ تعبیرش خواستند...... سید علیہ الرحمۃ لختے سر بگریبان آوردہ فرحاں و خنداں فرمودند کہ صاحب در ذہن ناقص چناں معلوم می شود کہ امانت حضرت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تجلائی کہ از وفات حضرت سید حسن رسول نما کہ مدت یک صد و پنجاہ سال گذشتہ موقوف و مسدود داشت اینک ایں حالت غریبہ بدست شما یا یکے از مریدان شما ظاہر

دفتر خواہد شد......"

(مخزن احمدی (قلمی)، ورق ۲۸، الف و ب مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ نمبر ۱۲۸۰)

ہم نہیں سمجھتے کہ مولوی سید محمد علی صاحب نے یہ فقرہ (با یکے از مریدان شما) اپنی طرف سے تصنیف کیا ہو گا، کم سے کم سید صاحبؒ کے خلفاء اور رفیقوں کو ہم اس قسم کی کم ظرفیوں سے بہت بلند سمجھتے ہیں۔

تذکرہ نگاروں کا ذکر خیر ایک دوسرے موقع پر اس طرح کیا گیا ہے:۔

"ہمارے زمانہ کے مورخین نے اس تحریک کے بیان میں بہت غلطیاں کی ہیں، وہ سید صاحبؒ کا تعلق امام عبد العزیزؒ سے کاٹنا چاہتے ہیں اور امیر شہیدؒ کو ایک مہدی منتظر کے درجے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ (ص ۱۱۵)

ہمارے زمانے کے سیرت نگار مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی کی مقبول کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" پڑھ کر ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ انہوں نے امام عبد العزیزؒ سے سید صاحب کے تعلق کاٹنے کی کوئی ادنیٰ سی بھی کوشش کی ہے ؟ (ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید ص ۵۰ - ۵۳) اور ہمارے زمانے سے پہلے کے تذکرہ نگار مولوی سید محمد علی صاحب اور مولوی محمد جعفر تھانیسری (اسیر پورٹ بلیئر و منہم مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء) کی کتابیں موجود ہیں۔ ہر منصف مزاج پڑھ کر فیصلہ کرسکتا ہے کہ مولانا کا یہ الزام کہاں تک صحیح ہے ؟ "مہدی منتظر" کا افسانہ سر اسر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے، جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔

سید صاحبؒ کے متعلق یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی، انہیں دینی علوم سے ضروری واقفیت تھی، اس سے کسی نے

انکار نہیں کیا" (سیرت سید احمد شہید ص ۵۸) لیکن بدگمانی کا بُرا ہو، مولانا اس سے بھی غلط نتیجہ نکالتے ہیں :-

"........اس طرح پر ہم سید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں، ان کے مناقب لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے، بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں، ان کی خواہش دراصل یہ ہے کہ سید صاحب کا جو تعلق تلمذ شاہ عبدالعزیز سے ہے، وہ کاٹ دیا جائے، اور وہ ایک امام مہدی کے طور پر مانے جائیں، ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا" (ص ۱۴۴)

مولانا فرماتے ہیں کہ " ان کے مناقب لکھنے والے دھوکا دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے "۔ اچھا تو سنئے، سید شہیدؒ کے وزیر و مشیر اور تتمہ دودمان ولی اللہی، حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (نضّر اللّٰہ وجھہ یوم القیامۃ) فرماتے ہیں :-

"........ اگرچہ احسن و اولیٰ در تالیف این کتاب چناں می نمود کہ بطوریکہ در تحریر اکثر مضامین ایں کتاب محض بر ترجمہ آنچہ از زبان ہدایت نشان حضرت ایشاں صدور یافتہ بود اکتفا کردہ شد، در تمامی مضامین ہمال راہ پیمودہ می شد، لیکن ازبسکہ نفس عالی حضرت ایشاں برکمالِ مشابہت جناب رسالت مآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در بدو فطرت مخلوق شدہ بنا بر علیہ لوح فطرت ایشاں از نقوش علوم رسمیہ و راہ دانشمندان کلام

وتقریر وتحریر مصنفی ماندہ بود .... الخ (دیباچہ صراط مستقیم ص ۶)
بتائیے، کیا مولانا شہید بھی دھوکا دے رہے ہیں؟

اب ایک آخری جملہ ملاحظہ ہو "حزب ولی اللہ کا پہلا دور" ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعہ بالاکوٹ پر امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کی اجتماعی تحریک کا ایک دور ختم ہو گیا، لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دیا جاتا ہے وہ پہلے امیر شہیدؒ کی عظمت پر زور دے کر ان کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتا ہے، اس کے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیز کا دخل تھا، اور نہ امام ولی اللہؒ کا اور نہ پشاور کی حکومت موقتہ کو دہلی میں مولانا محمد اسحاق کی امامت بالاستقلال سے (جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ دار تھی) کوئی تعلق تھا، اس کے بعد وہ آسانی سے امیر کی شہادت سے تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔" (ص ۷۵)

(الف) "چالاک تاریخ نویس" مشہد بالاکوٹ کو تحریک کا خاتمہ اس معنی میں قرار دیتا ہے کہ احیائے نظام خلافت راشدہ (حکومت دہلی کی تجدید نہیں) کی ایک منظم اور ہمہ گیر کوشش جو حضرت سید شہیدؒ کی قیادت میں ہو رہی تھی بظاہر ناکام رہی اور فوری طور پر اس نہج پر دوسری ہمہ گیر تحریک اٹھانے کی توقع بھی جاتی رہی، ورنہ سید شہید کے ماننے والے اس المناک واقعے

کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اسی مقصد عظیم کے لیے جان اور سر کی بازی لگات
رہے اور آج بھی ایک جماعت آیۂ ربانی :-

وَمِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب ۲۳)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں
جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے
اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پو
کر چکے ہیں اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور ان
نے ذرا تغیر تبدل نہیں کیا۔

کی یاد تازہ کر رہی ہے

(ب) امام ولی اللہؒ اور امام عبد العزیزؒ کی تجدیدی کوششوں کا کس
انکار کیا؟ البتہ محققین امام ولی اللہ اور امام عبد العزیزؒ کے درمیان فرق کرت
ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ ہندستان میں اسلامی تجدید کا سہر
مجدد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) شاہ ولی اللہؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور مولانا اسمٰعیل
شہید (ف ۱۲۴۶ھ) کے سر باندھتے ہیں۔ مولانا آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں مولانا
ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ (حضرت
مجدد سرہندی اور امام ولی اللہؒ کے بعد) حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی او
مولانا اسمٰعیل شہیدؒ دونوں بزرگوں کو "تجدید دین کی نئی تحریک" کا امام سمجھ

لے راقم نے ایک مرتبہ ۱۹۳۵ء میں مولانا آزاد مدظلہ سے عرض کیا کہ یہ مقام تجدید تو حضرت سید احمد شہیدؒ کا
منصب ہے، مولانا شہید بہر حال ان کے مرید تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ "میرا تاثر وہی ہے"۔

"تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی، اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا، مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمدؒ بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی، یہ وہ وقت تھا، جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا، ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا، اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی...." (مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ)

ہندستان میں اسلامی تجدید پر یہ مقدمہ بے مثال چیز ہے، لیکن اس میں کہیں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا نام مجدد یا مفکر کی حیثیت سے نہیں آیا، مولانا ابوالکلام اور کھل کر اپنے مخصوص انداز بیان میں رقم طراز ہیں:-

"..... پھر کیا اس وقت ہندستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟.... خود اس خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم و عمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی یاد شاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے،...... بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ خود وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی، سب دوسرے کاموں میں رہ گئے، یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا، لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا...."

(ملاحظہ ہو تذکرہ ص ۲۳۶، ۲۴۴)

اسی طرح مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بھی اپنے رسالہ تجدید و احیائے دین (ص ۸۰ - ۵۱) میں شاہ عبد العزیز صاحب کی امامت کا بالکل ذکر نہیں کرتے، (البتہ ان کے حلقۂ تدریس کی عظمت کا شاندار الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں) اور ان دونوں شہیدوں کو شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتے ہیں :-

"یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر گئے تھے، سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید کے منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے، دونوں جگہ وہی شاہ صاحبؒ کی زبان بولتی نظر آئے گی .... سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) دونوں، روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں اور ان ایک وجود مجدد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں ......" (ص ۷۰ - ۶۹)

اب آپ بتائیں کہ وہ کون "چالاک تاریخ نویس" ہے، جو اس سے زیادہ کچھ کہتا ہے؟ سید صاحبؒ کے تذکرہ نگار تو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو ان کا پیر اور استاد تسلیم کرتے آئے ہیں،

(ج) مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ کی امامت اور "امارتِ مطلقہ" البتہ

ہمیں تسلیم نہیں، ہم انھیں درس گاہ ولی اللّٰہی کا جانشین اور سید صاحبؒ کی جہادی سرگرمیوں میں معاون و مددگار مانتے ہیں، اس سے زیادہ کہیے تو ہم آپ کی اصطلاح اور زبان میں حکومت موقتہ کا "وکیل" مان لیں، روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان کے لیے "وکیل حکومت" ہی کا منصب تجویز کرتی ہے۔

(د) رہی "امیر شہیدؒ" کی عظمت اور اُس پر زد دینے کا سوال، تو یہ کوئی گناہ نہیں، اور اگر آپ کے خیال میں یہ گناہ ہے تو "صدر شہیدؒ" اس راہ کے پہلے خطاوار ہیں، 'صراط مستقیم' کے دیباچہ میں مولانا شہیدؒ نے سید صاحبؒ کے نامِ نامی کے ساتھ تکریم و توصیف کے جو القاب استعمال کیے ہیں، ان سے زیادہ آج تک کسی عقیدت مند نے نہیں لکھا ہوگا:۔

"امابعد می گوید...... بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کہ نعم الٰہی دربارہ ایں ضعیف نامتناہی است و از اعاظم آں حضور محفل ہدایت منزل طالعان فخر خاندان سیادت مرجع ارباب ہدایت مرکز دائرہ ولایت و دلیل سبیل فلاح و رشاد رہنمائے طریق استقامت و سداد، مظہر انوار نبوی متبع آثار مصطفوی سلالہ خاندان علیب طاہر سید الاولیاء اعنی علی مرتضیٰ نقاوۂ دودمان سبط اکبر سند الاصفیاء اعنی حسن مجتبیٰ، مقتدائے اصحاب شریعت پیشوائے ارباب طریقت، ہادی زمانہ مرشد یگانہ سراج المحبین تاج المحبوبین الامام الاوحد السید احمد متع اللّٰہ المسلمین بطول بقاءہ و نفعنا و سائر الطالبین باتوالہ

واحوالہ وایں ضعیف دراوان حضور آں مجلس ملائک انس باستماع

کلمات ہدایات آیات، الخ الخ (صراط مستقیم ص ۸)

ابو الحسن علی ندوی (صاحب سیرت سید احمد شہیدؒ) تو بہر حال محتاط
ہیں، مولوی جعفر تھانیسری جیسے عاشق صادق نے بھی تکریم و توصیف کے
اتنے القاب نہیں استعمال کئے۔ ہمیں بتایا جائے کہ وہ کون چالاک تاریخ
نویس" ہے، جس نے مولانا شہیدؒ سے زیادہ سید صاحبؒ کی عظمت پر
زور دیا ہے؟

ابھی ابھی مولانا سندھی کی اس شکایت کا ذکر آیا ہے کہ سید صاحب
کے تذکرہ نگار ان کے کمالات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں "تاکہ حضرت
شاہ عبدالعزیزؒ سے ان کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور وہ تحریک کے "مالک
ثابت ہوں" (ص ۵، ۱۴۴) ہم نے جواب میں عرض کیا تھا کہ شکایت بے جا
اور خلاف واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے سید صاحبؒ کے
تلمذ اور ارادت کا انکار کسی نے نہیں کیا، بلکہ اسے سب فخریہ بیان کرتے
آئے ہیں۔ حسن اتفاق سے اس سلسلہ میں مولانا سندھی کے استاذ الا
(اور استاذ بھی) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ) کے بعض ایسے
تاثرات نظر سے گذرے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کی
محبت و عقیدت میں انہیں حد درجہ غلو تھا، مناسب معلوم ہوا کہ حضرت
سید شہیدؒ کے متعلق مولانا سندھی کے استاذ (اور ان کے حزب دہلوی
امام) کے خیالات بھی ناظرین کے سامنے آجائیں، ملاحظہ ہو:-

مولانا حکیم سید عبد الحیؒ (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا رشید احمد صاحبؒ کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"..... فرمایا کہ سب مشائخ طبیب امت ہیں، اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے اعتبار سے طرق انہوں نے رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے..... بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کر دی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحبؒ ہوئے"۔ پھر فرمایا کہ مجھ کو حضرت سید صاحبؒ کے ساتھ محبت و عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبد العزیزؒ صاحب سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانے کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں، یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں، اللہ تو ہی جانے میں مجبور ہوں......"

(ارمغانِ احباب: معارف جلد ۱۳ ص ۳۴۴)

اس اقتباس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ محبت و عقیدت کا کوئی آئین نہیں ہوتا، سید صاحبؒ کے کسی تذکرہ نگار نے انہیں حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ (ف ۱۲۳۹ھ) پر ترجیح نہیں دی لیکن مولانا رشید احمدؒ جیسے ربانی عالم انہیں حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی بڑھا سمجھتے ہیں، جب حزب دہلوی کے ہر کرتا میں محبت و عقیدت کا یہ انداز تھا تو پھر ایک مخصوص خطہ یا خاندان کو موردِ عتاب بنانا کہاں تک بجا کہا جا سکتا ہے؟

یہاں تک تذکرہ تھا حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفیقوں کا اور

اور مولانا سندھی کی تشریح کے مطابق حزب ولی اللہ کے دو زاویوں کا،

حضرت سید شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا سندھی اُن کے اہل حدیث رفیقوں اور اہل صادق پور کے زیادہ شاکی ہیں، عام اہل حدیث سے صرف اتنی شکایت ہے کہ وہ افغان علاقے میں بھی عمل بالحدیث سے باز نہ آئے۔

"اب حزب ولی اللہ کی خصوصیات پر زور نہیں دیا جاتا، بلکہ نجدی و یمنی طریقوں پر کام کرنے والے ہندستانی، حنفی فقہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے، جس سے افغانوں کو مجاہدین سے مذہبی عداوت پیدا ہوگئی، امیر شہیدؒ نے بارہا کوشش کرکے علمائے افاغنہ اور عوام کو یقین دلایا کہ امیر اور ان کا خاندان ہمیشہ محققین حنفیہ کے طریقہ کا پابند رہا ہے، مگر حزب ولی اللہ کی امتیازی خصوصیات تسلیم نہ کرنے والے لوگ اس پابندی کو قبول نہ کرتے، اور معاملہ روز بروز بگڑتا گیا۔" (ص ۱۵۹)

مصلحت وقت کے لحاظ سے ان عاملین بالحدیث کے "اصرار" (اگر انھوں نے واقعی حضرت سید شہیدؒ کے سمجھانے کے باوجود عمل بالحدیث پر اصرار جاری رکھا) کے متعلق جو کچھ کہا جائے، پر امام ولی اللہ دہلوی (ق ۱۱۷۶ھ) کا نام لے کر تو ان پر زبانِ طعن کو دراز نہیں کیا جاسکتا، حضرت شاہ صاحبؒ جو خاکہ بنایا تھا اس پر سب سے پہلے خود ان کے پوتے ہی نے عمل درآمد شروع کردیا تھا،

"جب مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے حجۃ اللہ امام عبدالعزیزؒ سے پڑھی تو

اپنے جد امجد کے طریقہ پر عمل شروع کر دیا، انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی، جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرتے، اور وہ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ سُنن پر عمل کرتے تھے، اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم اُن پر اعتراض نہیں کر سکتا" (ص ۱۶۱)

جب صورت حال یہ ہے تو پھر آپ فقہ حنفی کی پابندی کو حزب ولی اللہ کی خصوصیات میں کیوں داخل کرتے ہیں؟ کیا حضرت شاہ صاحبؒ کے مشرب کے مطابق ان جزئیات میں رواداری نہیں برتی جا سکتی؟

اب صرف افغانی علاقہ میں "عمل بالحدیث" کا سوال باقی رہ جاتا ہے، مولانا کی روایت ہے:-

"جب افغانی علاقہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا، تو امیر شہیدؒ نے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ رفع یدین کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا، رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے، امیر شہیدؒ نے کہا کہ مولانا! اب رضائے الٰہی کے لئے رفع یدین کرنا چھوڑ دیجئے۔ اس کے بعد مولانا شہیدؒ کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیئے۔" (ص ۲-۱۶۱، بروایت امیر شاہ خان مرحوم)

اولاً تو ہمیں اس شاذ روایت کے قبول کرنے میں تامل [1] ہے، مولانا شہیدؒ کی

---

[1] ہندوستان میں اہل علم کی ایک بڑی جماعت امیر شاہ خان کی اس روایت کو افسانہ "ذرا" دیتی ہے، راقم نے صرف تامل ظاہر کیا ہے۔

تنویر العینین پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ تقلید کے دائرے سے نکل کر عمل بالحدیث کو اپنا شعار بنا چکے تھے۔ لیکن ہم صرف اس بنیاد پر روایت کی تکذیب نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے مصلحت وقت کی خاطر انھوں نے سید شہیدؒ کے مشورے سے رفع یدین وغیرہ ترک کر دیا ہو۔ یہ کوئی فرض و واجب کا سوال تو ہے نہیں۔ سنن، مستحبات ہیں عاملین و تارکین میں سے کسی کو بھی متشدد نہیں ہونا چاہیے اور جہاں تک اس خاکسار کی حقیر معلومات کا تعلق ہے، امام ولی اللہ کا مسلک یہی تھا۔ امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) نے بھی اس پر بار بار زور دیا ہے۔[1]

لیکن حزب ولی اللہ کی تشکیل جدید کا دم بھرنے کے باوجود مولانا

---

[1] ملاحظہ ہو۔ فتاویٰ ابن تیمیہ جلد دوم ص ۳۸۰ تا ۳۸۵ مطبوعہ کردستان العلمیہ۔

بات پر بات نکلتی ہے، امام ابن تیمیہ کی مناسبت سے مولانا سندھی کی ایک عجیب بات یاد آگئی، وہ ابن تیمیہؒ کے علم و فضل کے تو مداح ہیں لیکن ان کے خیال میں امام کے لطیف نکتے اہل ہند کے دماغ میں نہیں اتر سکتے۔ یعنی یونانی خرافات اور متکلمین کی پیچ در پیچ باتیں تو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں لیکن قرآن اور حدیث کی سادہ اور فطری سچائیاں ان کے ذہن اور دماغ میں نہیں سما سکتیں، اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہو سکتی ہے؟ معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو اچنبھا نہ ہوتا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:۔ "ہمارے اہل حدیث بھائی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے دقیق مسائل سے حظ اٹھاتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ کیا یہ لطیف علوم ہندوستان کا متوسط طبقہ بہ آسانی قبول کر سکتا ہے؟ اس کے لئے عربی ذہنیت موزوں ہے"۔ (ص ۹۹)

کا رویہ عاملین بالحدیث کے ساتھ منصفانہ نہیں، جس کی ایک جہاں دیدہ وسیع النظر عالم سے توقع نہیں تھی، حیرت تو اس پر ہے کہ اس سلسلے میں غلط الزامات عائد کرنے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے، ملاحظہ ہو:۔

"مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علماء کے شاگرد تھے، باز نہ آئے، اور انہی لوگوں کے بیجا اصرار نے مشکلات پیدا کر دیں، امیر شہیدؒ نے ان کے رہنما کو جو محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا، اپنی جماعت سے نکلوا دیا، مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی"

نجدی اور یمنی علماء پر اطمینان سے گفتگو ہو گی، یہاں خاکسار صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہے کہ اہل حدیث عالموں کے جس رہنما کو مولانا زیدی شیعہ کہتے ہیں، وہ شیخ عبدالحق ابن فضل اللہ بنارسی مہاجر مکی (ف ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ) ایک متبع سنت سلفی عالم ہیں۔ ان پر زیدیت اور شیعیت کا الزام عائد کرنا بڑا ظلم ہے، مولانا نے ان کا ذکر خیر "مختلف جگہوں پر کیا ہے،" دو موقعوں پر زیدی شیعہ، (ص ۱۹۵، ۱۶۲)، اور ایک مقام پر نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) کا استاذ بھی بتایا گیا ہے، لیکن نام لینے سے احتراز رہا ہے۔ صرف ایک جگہ کتاب التمہید کے اقتباس میں ان کا نام آتا ہے:۔

....وانضم الیہ الشیخ عبد الحق ابن فضل اللہ البنارسی الذی ینتسب الی الصدر	اور ان کے ساتھ (یعنی مولانا ولایت علیؒ کے ساتھ) شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی مل گئے، جو مولانا اسمٰعیل شہید (صدر شہید) سے انتساب

الشہید و الذ عن الامام الشوکانی لکھتے ہیں' اور امام شوکانی کے بھی شاگرد ہیں ۔ (ص ۱۹۱)

یہی مضمون دوسری جگہ ایک اضافے کے ساتھ یوں ادا ہوتا ہے :۔

"جس ہندستانی عالم کو (جو بنا بر زیدی شیعہ تھا) امیر شہید نے اپنی جماعت سے نکلوادیا تھا' وہ بھی مولانا ولایت علی کے ساتھ شامل ہوگیا' نواب صدیق حسن خان اسی استاذ کے واسطے سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں" ......

(ص ۱۹۵)

ہمیں نہیں معلوم کہ امیر شہید نے انہیں کب "جماعت سے نکلوادیا تھا" کیا اس کا کوئی مستند ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے ؟

اب رہا شیخ عبد الحق بن فضل اللہ پر زیدیت اور شیعیت کا الزام تو اس کی حیثیت ایک بہتان سے زیادہ نہیں' دیکھیے کہیں "مرغ قبلہ نما" تو آپ کی انگلی کا نشانہ نہیں بن رہا ہے :۔

"مولانا عبد الحق بنارسی (م ۱۲۰۶ھ، ۱۲۷۶ھ[1]) علمائے اہل حدیث اور شاہ اسماعیل و مولانا عبد الحئی کے تلامذہ میں سے تھے' طلب حدیث کے شوق میں

---

[1] مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں ایک رسالہ دیکھا ہے جس میں مولوی عبد الحق بنارسی کے اخراج کا واقعہ مذکور ہے (برہان دہلی بابت مئی ۱۹۴۳ء)

افسوس کہ موجودہ حالات میں اس کی تحقیق بھی نہیں ہوسکتی' ہندستان کے کتاب خانوں میں کسی ایسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا' شیخ عبد الحق کے بارے میں ہماری معلومات اس کی تائید نہیں کرتیں' واللہ عندہ علم الصواب

[2] ان کی وفات ذالحجہ ۱۲۸۶ ہجری میں ہوئی' غالباً یہ کتابت یا طباعت کی غلطی ہے ۔

سفر کیا، اور قاضی محمد بن علی شوکانی، عبد الرحمٰن بن احمد بن الحسن البہکلی، شیخ عبد اللہ بن محمد بن اسمٰعیل الامیر الیمانی اور شیخ محمد عابد بن احمد علی السندی سے استفادہ کیا، اور حدیث کی عام اجازت حاصل کی۔"

(سیرت سید احمد شہید طبع دوم ص ۴۰۴ بحوالہ نزہۃ الخواطر قلمی)

"تاریخی نام "فضل رسول" اور تاریخ وفات "فضل رسول"۔ آپ کے والد بزرگوار مئو سے ترک اقامت فرما کر بنارس میں قیام پذیر ہوئے اور یہیں کے ہو رہے ...... جیسے استاذ اور ہم سبق آپ کو ملے، کب کسی کو نصیب ہوں گے۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی کے حلقہ درس میں، شہید علیہ الرحمۃ کے شریک سبق ہو کر حدیث پڑھ رہے ہیں، امیر المومنین (حضرت سید احمد مرحوم) اور مولانا اسمٰعیل شہید ایسے خطیبین کے ہمراہ زیارت حرمین سے مشرف ہوتے ہیں، دہلی سے تکمیل کے بعد یمن جا کر امام محمد بن علی، قاضی شوکانی سے حدیث پڑھ رہے ہیں، سند و اجازہ بنفسہ امام شوکانی سے حاصل ہے، ...... جن کے درس میں قاضی شیخ محمد مچھلی شہری اور مولانا قاضی سید جلال الدین بنارسی ایسے اعلام محدث ہوں اس درس کی شہرت اور وسعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، ......"

(تراجم علمائے حدیث ہند: ص ۳۴۴)

(م ۱۲۵۲ھ۔ ف ۱۳۲۴ھ) تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۰۔ ۳۷۴۔

۱۲۲۱ھ۔ ف ۱۲۷۹ھ) تراجم علمائے حدیث ہند ص ۶۔ ۳۴۵۔

یہ تو اپنوں کی روایت تھی، اب ذرا تفریح کے لیے غیروں کی بیانی ہوئی کہانی بھی سنیئے، اس سے معلوم ہوگا کہ شیخ عبدالحق کی مظلومیت کوئی نئی نہیں۔ اپنے شیخ حضرت سید احمد شہیدؒ اور استاذ مولانا شہیدؒ کی طرح یہ بھی غیروں کے حلقے میں نیک نام نہیں، جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما مسٹر اوکینلے James (O. Kinealy) مولانا ولایت علی کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:-

"ایک معلم کی حیثیت سے نمودار ہونے سے پہلے یہ (مولانا ولایت علی) بنارس کے ایک متعصب وہابی عبدالحق کے مرید ہو گئے تھےلہ اس شخص کا اصلی نام غلام رسول (؟) تھا، لیکن وہابی تعلیمات اختیار کرنے کے بعد اس نے یہ غیر مذہبی نام ترک کر دیا۔ اور عبدالحق نام اختیار کیا اس کے بعد یہ مکہ گیا۔ جہاں اس کے "بدعقائد" خیالات کی خبر ترکی حکام کو ہوئی، گرفتاری کا حکم صادر ہوا، لیکن یہ کسی طرح نجد پہنچ گیا (؟) چند سال نجد میں رہ کر یہ بنارس واپس ہوا، جہاں یہ شیخ نجدی کے نام سے مشہور تھا مولوی ولایت علی اس کے اولین حلقہ بگوشوں (Converts) میں تھے۔

ایک دوسرے صاحب اسی میں نمک مرچ لگا کر یوں خامہ فرسا ہیں

لہ اوکینلے کا مقالہ: The Wahabis in India مندرجہ کلکتہ ریویو

مولانا ولایت علی شیخ عبدالحق کے مرید یا شاگرد نہیں تھے، البتہ دونوں ایک استاذ (مولانا اسمٰعیل شہید) کے شاگرد اور ایک شیخ (حضرت سید احمد شہیدؒ) کے مرید تھے۔

"ایک بات اور بھی ہے، جس میں ہندستانی وہابی اپنے عرب بھائیوں سے الگ ہیں، یعنی یہ کہ سید احمد امام مہدی ہیں (؟) ولایت علی (عبدالحی کا ایک مرید بجنوری میں وہابی ہو چکا تھا، لیکن بنارس میں رہتا تھا) نے اس عقیدے کی تبلیغ کی، اور اس پر ایک کتاب بھی لکھی (؟)"[1]

اپنوں کی روایت کے ساتھ آپ نے غیروں کی "تلبیس" بھی دیکھ لی، اب خود شیخ عبدالحق کی زبانی ان کے حالات وخیالات معلوم کیجیے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) کو روایت حدیث کی اجازت دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

...... وبعد فان الشیخ الفطن ....
مولانا السید صدیق حسن نجل
مولانا السید اولاد حسن المحدث
القنوجی ...... طلب منی اجازة
عامة ومثلی من یطلب ولست
باهل ان اجاز فکیف ان
اجیز ولکن الحقائق قد تخفی وقد
من اللہ تعالیٰ علیّ بالمثول عند

(حامداً ومصلیاً) مولانا سید اولاد حسن محدث
قنوجی کے صاحبزادے فاضل لبیب مولانا
صدیق حسن نے مجھ سے (روایت حدیث کی)
عام اجازت مانگی، حالانکہ مجھ جیسا آدمی
ان سے اجازت طلب کرتا، اور میں تو اجازت
تک دیئے جانے کا بھی اہل نہیں، چہ جائیکہ میں
خود اجازت دوں۔ لیکن بعض اوقات
اصلیت چھپ جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے

---

[1] E. Rehatsek کا مضمون:-
The history of the wahhabys in Arabia and in India
مندرجہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی۔ بمبئی جلد ۱۴ (۱۸۸۰ء) ص ۳۶۱

ائمة السنة النبویہ والسماع منهم للآثار والاحادیث المصطفویة واخذ الاجازات عنهم فاولهم واجلهم الامام الهمام فخر الاسلام العالم الربانی مولانا قاضی محمد بن علی الشوکانی ......

......[١] وقرأت اکثر کتب الحدیث علی اسوة المحدثین وارث علوم سید المرسلین العلامة النبیل مولانا شیخی محمد اسمٰعیل الشهید تغمده الله بغفرانه المدید علی شیخی

فضل وکرم سے حقیر کو ائمہ سنت نبوی کی خدمت میں حاضری' ان سے حدیثیں سننے اور اجازتیں حاصل کرنے کا موقع ملا' ان میں سب سے اول اور مقدم عالم ربانی' فخر اسلام امام اجل مولانا قاضی محمد بن علی شوکانی ہیں .... اور میں نے حدیث کی اکثر کتابیں علوم نبوی کے وارث' اسوۂ محدثین علامہ جلیل مولانا شیخ محمد اسماعیل شہید (تغمده الله بغفرانه المدید) اور اپنے شیخ ومرشد مولانا شاہ عبد الق[ادر] (اعلی الله درجاته وخص ب[ہ]) اور علماء وفقہاء کے سرتاج' محدثین وکاملین کے سرخیل' مولانا شاہ

---

[١] اس کے بعد اپنے دوسرے شیوخ یمن وحجاز کے نام لئے ہیں' جن میں امام عبد اللہ بن محمد اسمٰعیل الامیر (ف ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) عبد الرحمٰن بن احمد حسن بهکلی (ف سنہ) زیادہ نمایاں ہیں۔ (تفصیل کے لئے: اتحاف النبلاء ص ۲۶۴)

[٢] "شیخی ومرشدی" کے فقرے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شیخ عبد الحی مولانا شاہ عبد القادر صاحب (ف ۱۲۴۳ھ) سے بیعت تھے' مصنف سیرت سید احمد شہید نے انہیں سید صاحب کے خلفاء میں شمار ک[یا]

وموصی مولانا الشاہ عبدالقادر
اعلی اللہ درجاتہ وخصہ بہا وعلی
اکمل العلماء وافق الفقہاء و
قدوۃ المحدثین عمدۃ الکاملین
الشیخ العلامہ مولانا شاہ عبدالعزیز
الدہلوی قدس اللہ سرہ بلطفہ الخفی
والجلی ..... واوصیہ بتقوی اللہ
عز وجل واتباع الحق اینما کان ومع
من کان والعمل بصحیح السنۃ
ومجانبۃ البدعۃ والاستقامۃ علی
قدم الحق والصدق ..... قالہ بفمہ
وحررہ بقلمہ خادم السنۃ النبویۃ
عبدالحق المحمدی ..... فی سلخ رجب
سنۃ خمس وثمانین ومائتین والف
الہجریۃ ۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۶۳)

عبدالعزیز دہلوی (قدس اللہ سرہ بلطفہ
الخفی والجلی) سے پڑھیں ....
.... اور میں انہیں تقویٰ
الٰہی کے ساتھ ساتھ اتباع حق کی نصیحت
کرتا ہوں، حق جہاں بھی ہو، اور جس کے
ساتھ بھی ہو اس کی اتباع کرنا چاہیے۔
(اسی طرح) صحیح سنت پر عمل کرنے بدعت
سے بچنے اور حق وصداقت کی راہ پر ثابت
قدم رہنے کی (نصیحت کرتا ہوں) ......
...... یہ (سب کچھ) سنت نبوی کے
خدمت گذار عبدالحق محمدی نے اپنی زبان
سے کہا، اور (یہ سطریں) اپنے قلم سے
لکھیں۔

مورخہ آخر (۲۹ یا ۳۰) رجب ۱۲۸۵ھ ہجری

کیا اس "اجازت نامہ" کے بعد بھی ان پر زیدیت اور شیعیت کا الزام رکھا جائے گا؟ اگر اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی تھی تو اب دور ہو جانا چاہیے، نجد و یمن کے مجتہد الفکر محقق سلفی عالموں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا کوئی جرم نہیں، اور

عبدالحق بنارسی تو علمائے ہند میں سے پہلے اساطین خانوادہ ولی اللّٰہی کے شاگرد اور کفش بردار ہیں، البتہ ان کی نظر ہندستان تک محدود نہیں، اور اس طرح پر وہ مولانا سندھی کی اصطلاح میں "انٹرنیشنلسٹ" ہیں، اور ہمارے مولانا کے ہاں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں۔[1]

---

[1] مولانا فرماتے ہیں: "..... اس طرح حزب ولی اللّٰہ کو ایک نیشنل پارٹی سمجھنا چاہیئے، جو انٹرنیشنل رجحان رکھتی ہے، اور ان ہندستانیوں کو جو نجدی یمنی ذہنیت رکھتے ہیں، ایسی پارٹی سمجھنا چاہیئے، جو انٹرنیشنل نقطہ نظر کو اساس قرار دیتی ہے (ص ۱۶۳)"..... مثلاً روس میں ٹروٹسکی کی جماعت "انٹرنیشنل نظریہ رکھتی ہے، واضح رہے کہ ٹروٹسکی یہودی النسل ہے، اس کے مقابلہ میں اسٹالن جو خالص روسی ہے، کی جماعت انٹرنیشنل میلان رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سٹالین نے ٹروٹسکی کی ساری جماعت کو جو عموماً یہودی تھی قتل کرا دیا، اسی طرح اسلام ایک انٹرنیشنل تحریک ہے اور عربی ترکی ایرانی ہندی (یہ سب نیشنل تحریکیں ہیں، ایک عرب جو اسلامی میلان رکھتا ہے یا ایک ہندی جو اتحاد اسلام کی فکر رکھتا ہے" (یہ مثال ہوگی اسٹالین کی، اور ایک ایسا آدمی جو سوائے اتحاد [illegible] کے اور کوئی چیز نہیں مانتا جیسے یمنی نجدی تحریکوں سے متاثر ہندستانی، یہ ہے مثال ٹروٹسکی کی کیونکہ وہ بجز اسلام کے سب چیزوں کو نہیں مانتے، ہندستانیت، عربیت وغیرہ ان کے ہاں کوئی چیز نہیں ہے لہٰذا ان ہر دو جماعتوں میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے" (ص ۳-۱۶۲) جی چاہتا تھا کہ ٹروٹسکی اور اسٹالین کی تشبیہ پر کچھ عرض کروں، مگر طول کلام کے خوف سے رک گیا تو اب مولانا کی توجیہ کے مطابق ہمیں نجدی و یمنی تحریکوں سے متاثر ہندستانیوں کی انٹرنیشنلزم ہی پسند ہے اور واقعی ہم اسلام

بہرحال شیخ عبد الحیؒ کی زیدیت سے براءت کے لئے یہ اجازت نامہ کافی ہے اگر کسی کو اس سے بھی اطمینان نہ ہو تو مزید ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے لیکن مولانا کا الزام خود قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) پر ہے، وہ نیل الاوطار کے مصنف کو زیدی ہی سمجھتے ہیں[1] اور اہل صادق پور کی فردِ جرم میں شوکانی سے

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) کے سوا سب چیزوں کو نہیں مانتے" اور ہمارے ہاں ہندستانیت، عربیت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اب آپ چاہے ٹروٹسکی کی طرح جلاوطن کر دیں یا پھانسی پر لٹکا دیں، ہم تو اسلام اور اتحاد اسلام کی رٹ لگاتے ہی رہیں گے، یہ ایک "سخن گسترانہ بات تھی" جو "مقطع" کے بجائے حاشیے میں آگئی، ورنہ ہمیں مولانا کی اس تعبیر و توجیہ سے اتفاق نہیں۔

[1] مولانا سندھی زیدیت اور شیعیت کا ذکر ایک ساتھ انداز میں کرتے ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ زیدیت اور عام شیعیت (اثنا عشریت) میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، اور یہ اس لئے کہ عقیدۂ غیبوبت (یعنی سید صاحبؒ کے عدم شہادت کا خیال) کا سلسلہ بھی اور شوکانیؒ سے ملایا جائے، حالانکہ زیدیہ اور اثنا عشریت میں بڑا فرق ہے۔ امام "منتظر" کا عقیدہ اثنا عشریت کا لازمی جزو ہے، زیدی تو حضرت زید بن علی بن حسینؓ بن علی بن ابی طالب (ش ۱۲۲ھ) کو مانتے ہیں، اور امام غائب کے قائل نہیں (الملل والنحل، شہرستانی ص ۱۱۰-۱۱۵، طبع یورپ) اس لئے بفرض محال امام شوکانی کو اگر زیدی مان بھی لیا جائے تو اس سے عقیدۂ غیبوبت کا سلسلہ بھی اور شوکانی سے نہیں ملتا۔ سید صاحبؒ کی غیبوبت کا خیال ہندستان ہی کے خاص حالات کی پیداوار ہے، یہ عام مجاہدین کی ایک لغزش تھی، مغربی تحقیق کرنے والوں کی طرح خواہ مخواہ باہر سے سلسلہ ملانے کی ضرورت نہیں، بہرحال غیبوبت کی بحث آگے آتی ہے، زیدیت و یمن کی بحث اپنی جگہ پر آئے گی۔

تلمذ" اور نجدی و یمنی تحریکوں سے ہم آہنگی بھی ہے' نجدی یمنی اور ہندستانی تحریکوں کا باہمی تقابل ایک دلچسپ بحث ہے اور مولانا سندھی نے ہندستانی اور نجدی اور اسی طرح ہندستانی اور یمنی تحریکوں کے فرق پر بڑی گہری اور نکتے کی باتیں لکھی ہیں' البتہ وہ نجدی اور یمنی تحریکوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک دونوں بالکل ایک ہیں' جہاں تک روح کا تعلق ہے ہندستان کی تحریک جہاد و تجدید (یعنی حضرت سید صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک)، اور نجد و یمن، کی دعوت توحید میں کوئی فرق نہیں' مولانا عبیداللہ سندھی جیسا وسیع النظر اور دقیقہ رس عالم تقویۃ الایمان (مولانا شہیدؒ) اور کتاب التوحید (شیخ محمد بن عبدالوہاب) کی تعلیمات میں صرف دو جزئی فرق نکال سکا ہے۔ (ص ۱۳۶-۷) اسی طرح سلفی عالم امام شوکانیؒ کی ارشاد الفحول فی تحقیق الحق من علم الاصول" اور مولانا شہیدؒ کی اصول فقہ میں اجماع کی بحثیں ایک دوسرے سے مختلف نگاہ سے لکھی گئی ہیں اور مولانا سندھی نے اس اختلاف کو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے (ص ۱۴۰، ۱۳۸) اگر ان جزئی اختلافات کے باعث نجد و یمن اور ہندستان کی تجدیدی تحریکیں ایک دوسرے سے الگ کہی جا سکتی ہیں' اور ان میں سے ایک کے لئے دوسرے کے ساتھ ارتباط قائم کرنا جرم قرار دیا جا سکتا ہے' تو پھر نجد و یمن کی تحریکوں کا ایک سمجھنا بھی صحیح نہیں

۵ے مولانا نے گرامی نامہ مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۴۳ء میں اس شبہ کی تردید فرماتے ہیں' وہ نجد و یمن کو ایک نہیں سمجھتے ان کا کہنا یہ ہے کہ بعض اہل حدیث یمن کے معتقد ہیں (جیسے نواب صاحب اور ان کے اعوان) اور بعض نجد سے وابستہ جیسے امرتسر کا غزنوی خاندان' اور ان کے نزدیک بیرون الہند سے یہ تعلق "ناقابل معافی جرم" ہے۔

نجد و ہند کی تحریکوں میں جتنا اختلاف ہے، اس سے کہیں زیادہ فرق علمائے نجد و یمن کے افکار میں ہے، جس کی تفصیل اس ضمنی بحث میں نہیں ہو سکتی نجدی، یمنی، اور ہندستانی تحریکوں کا باہمی تقابل جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، ایک دلچسپ موضوع بحث ہے اور مستقل فرصت چاہتا ہے، آگے چل کر انشاء اللہ اس پر مفصل گفتگو ہوگی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم پھر اپنے موضوع پر آجاتے ہیں، سید صاحبؒ اُن کے تذکرہ نگاروں اور شیخ عبدالحق بنارسیؒ کے بعد مولانا سندھی کو زیادہ شکایت مولانا ولایت علی صادق پوری (ف سنہ ۱۲۶۹ھ) اور ان کے ہم مشرب اصحاب سے ہے، مولانا ولایت علی صادق پوری سے ہمارے مولانا خاص طور پر برافروختہ ہیں، اس کی وجہ خود ان کی زبان میں یہ ہے:

"...... کہ مولانا ولایت علی نے مولانا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنائی" (ص ۱۱۲)

گویا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اولاً خود سید صاحبؒ ہی کی بیعت امارت مولانا محمد اسحاق کی امارت مطلقہ کے خلاف بغاوت تھی، (جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے) اب سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں نے بھی اپنا سلسلہ الگ قائم رکھا، اور انہوں نے مولانا محمد اسحاق کی دہلوی پارٹی (حزب دہلوی) میں شرکت نہیں کی، اور اسی کو وہ "انشقاقِ جماعت" سے تعبیر کرتے ہیں:۔

"لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ دہلی سے باہر جس قدر جماعتیں حزب ولی اللہ

سے تعلق رکھتی تھیں، ان تمام جماعتوں نے الصدر الحمید کی رہنمائی پر اتفاق کر لیا تھا، بلکہ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ بالاکوٹؒ کی مصیبت عظمیٰ اپنے پیچھے اپنی مستقل یادگار چھوڑ گئی ہے وہ ہے "انشقاق الجماعۃ" یعنی اس کے بعد حزب ولی اللہؒ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا۔" (ص ۱۹۰-۱۸۹)

اس "انشقاق" کا ذکر، دوسری جگہ ایسے انوکھے انداز میں ہوتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، پڑھیے اور جی چاہے تو مولانا کے طریق فکر کی داد دیجیے:-

"مشرقی مغربی ہند کی رقابت تاریخ میں قدیم سے چلی آتی ہے چندر گپتا سورج بنسی خاندان اسی مغربیت اور مشرقیت کے دوسرے عنوان ہیں، ہمارا یہ خیال ہے کہ رقابت مذکورہ بعد از اسلام بھی قائم رہی اور امیر شہیدؒ کے وقت میں بھی وہ برسر کار آئی[1] امیر شہیدؒ مشرقی ہند رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے عام مریدینؒ بھی بہار وغیرہ کے ہیں، اس کے بالمقابل مغرب یعنی دہلی ہے، وہ لوگ دہلی

---

[1] ہر بات کی کہاں تک تردید کی جائے، لیکن مولانا کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سید صاحبؒ کے اثرات پورب ہی کے علاقوں میں محدود تھے، یا یہ کہ پچھم کے عوام و خواص پر ان کا اثر بہت کم تھا، حقیقت یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے عقیدت مندوں کا حلقہ پورب اور پچھم کو یکساں محیط تھا، دہلی، سہارن پور، مظفر نگر وغیرہ تو ان کے عقیدت مندوں کا مرکز تھے۔

(ملاحظہ ہو: ارمغانِ احباب از مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ: معارف جنوری۔جون ۱۹۳۹ء)

تحریک کو اپنا بنانا چاہتے ہیں، اسی لیے مولانا ولایت علی بہاری نے مولانا اسحاق کے خلاف دوسری جماعت تیار کی، وہ مولانا اسحاق اور سید دہلوی کو اس میدان سے دور ہٹانا چاہتے ہیں۔ (ص ۱۳۵-۶، حاشیہ)

ذہانت بھی عجیب چیز ہے، مولانا عبید اللہ کی ذہانت کی تعریف سنا کرتا تھا، آج اس کا مشاہدہ ہوا۔ کہاں چندر بنسی اور سورج بنسی رقابت؟ کہاں سید شہید کے خلیفہ خاص، اور مولانا شہید و قاضی شوکانی کے شاگرد مولانا ولایت علی عظیم آبادی؟ یہ ذہانت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اولاً تو پارٹی بنانے اور انشقاق جماعت کا الزام بے بنیاد ہے، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مولانا محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) اور مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف مان بھی لیا جائے تو اس سے چندر بنسی اور سورج بنسی، دلی اور بہار، پچھم اور پورب کی رقابت کہاں ثابت ہوتی ہے؟ یہ نسل اور زمین کی عصبیت تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی ہوگی۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب امت کی سرسبز امیدیں بالاکوٹ کی سرزمین میں دفن ہو گئیں اور چھوٹے بڑے سب پر ناامیدی چھا گئی اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، اور ساری جماعت تتر بتر ہو رہی تھی ایسے نازک وقت میں مولانا ولایت علی صادق پوری (جو سید صاحب کے خاص خلفا میں تھے، اور انہی کے حکم سے ایک تبلیغی مہم پر دکن گئے ہوئے تھے) نے گرتے ہوئے علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور مرتے دم تک سید شہید کی مہم کو چلاتے رہے۔ ان کے بعد ان کے عزیزوں، رشتہ داروں، بھائیوں، بیٹوں اور عام ماننے والوں نے جہاد فی سبیل اللہ کی مہم جاری رکھی، اور اس کی ان کے

خاندان والوں نے اتنی گراں قیمت ادا کی، اور ایسی قربانیاں پیش کیں جن کا نمونہ ہندوستان کی کوئی اسلامی یا غیر اسلامی تحریک نہیں پیش کر سکتی، بس مولانا ولایت علی کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے سید صاحبؒ کی شہادت کی خبر سنتے ہی دکن سے وطن کا رُخ کیا، اور مجاہدین کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے جوڑنے اور بکھرے ہوئے شیرازے کی تنظیم میں مصروف ہو گئے، (۱۲۴۸ھ) اب اسے پارٹی بازی کہیے یا "انشقاق جماعت" آپ کو اختیار ہے، ہم اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا محمد اسحاقؒ گیارہ بارہ سال ہندوستان میں رہے (ہجرت: ۱۲۵۸ھ) اور مولانا ولایت علی کی سرگرمیوں کے خلاف ان کی زبان سے کبھی ایک حرف نہیں نکلا،

نیز مولانا سندھی ہی کا ارشاد یہ بھی ہے کہ مولانا محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۷ھ کے لگ بھگ اپنا نیا پروگرام مرتب کیا:-

> "الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال کے غور و فکر سے امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کر لیا (ص ۱۴۲)،

اور پھر ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا ولایت علی نے ۱۲۴۸ھ میں اپنے ماننے والوں سے از سرِ نو جہاد کی بیعت لی،[1] تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مولانا ولایت علی ۱۲۴۸ھ سے ۱۲۵۷ھ تک اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے، اور مولانا

---

[1] والامیر ولایت علی انضم الیه عامة الشرقیین من البهار (؟) والبنغالة (؟)، فاقام الی تجدید بیعة الجهاد بمحل اقامته صادقپور سنة ۱۲۴۸ (ص ۱۹۱)

محمد اسحاق کم از کم اس سے ناخوش نہیں تھے، اور اُس وقت تک منظم طور پر وہ خود کوئی تحریک نہیں چلا رہے تھے، بلکہ ہمارے پاس اس کا ثبوت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔[1]

مزید براں ہمارے مولانا اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حزب دہلوی اور حزب صادق پوری کی تفریق مولانا محمد اسحاق کی وفات کے بعد ہوئی :-

فهاجر الشيخ الى الحجاز فتوفى فى مكة سنة ١٢٦٢ وبعد ما توفى ظهر فى المنتسبين الى الطريقة الولى اللهية الطائفتان الحزب الدهلوى والحزب الصادق پورى' (ص ۱۹۱)	(تو شیخ حجاز ہجرت کر گئے، اور مکہ مکرمہ میں وفات پائی (۱۲۶۲ھ) اور ان کی وفات کے بعد طریقہ ولی اللہی پر چلنے والے دو فرقوں میں بٹ گئے، حزب دہلوی اور حزب صادق پوری۔

---

[1] مولانا ولایت علی کے بھتیجے مولانا عبد الرحیم صادقپوری (مولود ۱۲۵۱ھ۔ متوفی ۱۳۲۱ھ) تذکرہ صادقہ میں رقم طراز ہیں :-

"جناب مولانا ولایت علی نے شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نبیرہ مولانا شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ دہلوی کی خدمت میں ترجمۂ قرآن از شاہ عبد القادر صاحبؒ اور رسائل مولانا اسماعیل شہید کے ارسال کی درخواست کی، اور جناب شاہ صاحبؒ کے ارسال فرمانے پر بمبئے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کے طبع کرانے کی سعی فرمایا، بعد انکار صاحب مطبع آپ نے زمانہ دورۂ سیر بنگال کے اس خدمت طبع کو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزماں صاحب بردوانی کے حوالہ فرمایا، چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے ایک ٹائپ پریس قیمتی دس ہزار خرید کر کے بکرات ومرات تعمیل ارشاد کیا .... (ص ۱۱۶)

تو پھر ان شہادتوں کی موجودگی میں مولانا ولایت علیؒ پر مولانا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنانے کا الزام کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے؟

اوپر کی تفصیل سے کم سے کم یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مولانا ولایت علی نے مولانا اسحاق کے مقابلہ میں کوئی پارٹی نہیں بنائی، لیکن ہمارے مولانا صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے وہ مولانا محمد اسحاقؒ سے لے کر مولانا شیخ الہندؒ تک مختلف علماء و مشائخ کی مسلسل امامت و امارت ثابت کرنے کے لیے اہل صادق پور پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں اور کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ سے ہٹ گئے تھے ان پر نجد کی وہابیت اور یمن کی زیدیت اثر انداز ہو گئی تھی، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی حکمت کے اصلی وارث اور ان کی راہ پر ٹھیک ٹھیک چلنے والے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے شیوخ (اساتذہ) ہیں، ہمیں ان شیوخؒ کے علم و فضل، تقویٰ و صلاح اور خدمات کا پورا پورا اعتراف ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ ان حضرات کی سیاسی پالیسی صادق پوریوں اور

---

(۱) شاہ محمد اسحاق صاحب (ف ۱۲۶۲ھ) کے شاگرد حاجی امداد اللہ صاحب (ف ۱۳۱۷ھ) ان کے شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی (ف ۱۲۹۷ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ) اور ان تینوں کے شاگرد اور جانشین (ص ۱۸۶) مولانا محمود الحسن شیخ الہند (ف ۱۳۳۹ھ) اور مولانا شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی۔ گو مولانا کو مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تلمذ حاصل ہے۔ (ص ۱۸۸)

سید شہیدؒ کے عام ماننے والوں سے مختلف رہی ہو، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے" کہ حق و رشد کا انحصار انہی شیوخ میں ہے، اور ہندستان میں دینی اصلاح انہی کی ذات کے ساتھ وابستہ رہی، اور یہ کہنا یا سمجھنا کہ ان "شیوخ کے دامن شفقت سے جو وابستہ نہ ہوا اس پر ہدایت کی راہ بند ہو گئی"۔ ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں، سلسلۂ کلام دراز ہوتا جا رہا ہے، خاکسار یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (ف ۱۱۷۶ھ) کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کے خاندان میں نظر و فکر کے دو مختلف رجحان نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے، خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تو فقہ حنفی اور شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ لیکن شاہ عبد العزیز صاحب فقہ حنفی سے مقید نظر آتے ہیں۵، اور شاہ عبد العزیز صاحب (ف ۱۲۳۹ھ) کی زندگی

---

۵ واضح رہے کہ شاہ ولی اللہ کا مخاطب اعلیٰ طبقہ ہے، وہ تمام دنیا میں ایک ہی رنگ رکھتا ہے اس لیے ان کی باتیں دوسرے ممالک میں اسی طرح مانی جا سکتی ہیں جیسے ہندستان میں، مگر شاہ عبد العزیز اعلیٰ طبقہ کو چھوڑ کر متوسط اور عوام کو مخاطب بنا کر وہی عالی علوم ان تک پہنچانا چاہتے ہیں، تاکہ یہ علوم واضح ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ متوسط طبقہ ہر ملک کا جدا جدا ہوتا ہے، تو اب جو خصوصیات امام عبد العزیز کے طریقے میں موجود ہیں، وہ صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے ہیں، علمی طور پر ان کو اس بلندی فکری سے نیچے اترنے کی خود اپنی طبیعت کے رو سے نیز اپنے خصوصی ماحول (مثلاً اندان تلامذہ و اولاد) کے رو سے کوئی ضرورت نہیں۔

"اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ فقہ حنفی اور شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں اور شاہ عبد العزیز فقہ حنفی سے مقید ہیں"۔ (ص ۷۷، حاشیہ)

ہی میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) نے عمل بالحدیث کی طرح ڈال دی تھی اور دادا کے بنائے ہوئے خاکے میں ہونہار پوتے نے رنگ بھرنا شروع کردیا تھا، اور پھر تکیہ رائے بریلی کے سید زادےؒ کی صحبت نے تو ان کے نظر و فکر کی دنیا ہی بدل دی، دوسری طرف شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے مولانا محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) ہیں جن کے پروگرام میں مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حنفی مذہب کی پابندی شامل ہے:-

> "الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال غور و فکر سے امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کرلیا۔ ان کے پروگرام کے دو اصول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔
>
> (الف) حنفی مذہب کی پابندی۔
>
> (ب) اور ترکی سلطنت سے اتصال" (ص ۱۰۷)

کون نہیں جانتا کہ مولانا شہیدؒ کی روش یہ نہیں تھی، مولانا خود فرما چکے ہیں ک

لہ فرماتے ہیں:-

ولیت شعری کیف یجوز التزام تقلید شخص معین مع تمکن الرجوع الی الروایات المنقولۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصریحۃ الدالۃ خلاف قول الامام المقلد لہ۔ (تنویر العینین)

اور معلوم نہیں ایک شخص معین کی تقلید کا الت کس طرح جائز ہو سکتا ہے جبکہ ایسی صریح رسول سے منقول روایتوں کی طرف رجوع ممکن ہو یا جو اس امام خاص کے قول کے خلاف صاف صاف دلا

لہ ابھی یہ پورا تذکرہ اوپر شیخ عبدالحق کے سلسلے میں نقل ہو چکا

مولانا شہید نے حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرنے کے لئے ایک جماعت بنائی تھی، جو آمین بالجہر اور رفع یدین وسنن پر عمل کرتی تھی، (اسی قسم کی ایک روایت آگے بھی آتی ہے) تو کہنا یہ ہے کہ مولانا ولایت علی صادق پوری شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مسلک سے ہٹے نہیں تھے، البتہ ولی اللّٰہیوں میں مولانا شہیدؒ سے زیادہ متاثر تھے، اور ان کے شاگرد بھی ہیں، اور ان کی "خاص جماعت" کے وہ رکن بھی تھے، خود مولانا سندھی کے ارشادات ملاحظہ ہوں:۔

"...... بڑے بریلی میں مولانا شہیدؒ سے حدیث پڑھتے اور آپ کی جماعت کے نائب تھے"۔ (ص ۱۱۲ الجواد سیرت احمد شہیدؒ)

ومولانا ولایت علی کان من عظماء خواص اصحاب الصدر الشہید وکان الامیر الشہید یرسلہ داعیاً الی الجہاد فی الہند۔	(مولانا ولایت علی صدر شہید کے اخص ترین اصحاب میں سے تھے، اور امیر شہید انہیں جہاد کا داعی بنا کر ہندستان بھیجتے تھے۔)

"مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد فقط حجۃ اللہ پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی جو رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتی تھی، مگر امیر شہید کے سمجھانے سے مصلحت عامہ کے لئے، وہ جماعت ختم کر دی گئی۔ مولانا ولایت علی اس جماعت کے ممبر تھے، اب وہ علٰحدہ ہو کر در اصل اسی جماعت کا احیاء مقصد بتاتے ہیں۔ (ص ۹۳ احاشیہ)

ؔ۵ کس سے علٰحدہ ہو کر؟ مولانا شہیدؒ تو اپنے شیخ کے ساتھ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرما چکے، اب بار ہ کون گیا؟ جس کے ساتھ تھے، اور اب علٰحدہ ہو رہے ہیں؟

"پٹنہ کے مولانا ولایت علی مرحوم جو بالاکوٹ میں حاضر نہیں تھے، وہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی اس جماعت کے خاص رکن تھے جو مولانا شہید نے دہلی میں امام ولی اللہؒ کی اتباع کے لیے بنائی تھی"۔ (ص ۴-۱۹۳)

"مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق صدر جمعیۃ کا اصلاحی فکر قبول نہیں کیا۔ (ص ۱۹۴)

اصلاحی فکر یعنی حنفی مذہب کی پابندی اور ترکوں سے اتصال، وہ حنفی مذہب کی پابندی کو حجۃ اللہ کے خلاف اور ترکوں سے اتصال کو ہمیشہ بدعتوں اور تجدیدوں کے خلاف جانتے تھے"۔ (ص ۱۹۴-حاشیہ)

یہ خود مولانا سندھی کے بیانات ہیں، ہمیں صرف یہ دکھانا تھا کہ مولانا ولایت علی پر انشقاق جماعت کا الزام غلط ہے، وہ ہمیشہ جادۂ ولی اللٰہی پر گامزن رہے اور اپنے لازوال کارناموں سے وہ اپنے شیخ حضرت سید شہیدؒ اور استاذ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے سچے اور صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

یہاں تک تو صرف "انشقاق جماعت" پر گفتگو تھی، اب اس سلسلے کے دوسرے الزامات و مواخذات اعتراضات پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی صادق پوری کی خدمات، ان کے مشن اور کام کی نوعیت پر مختصر سے مختصر طور پر کچھ صحیح معلومات بھی پیش کر دی جائیں۔ تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے اس اعتراض و جواب کا پس منظر سامنے آ جائے:-

"مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے، مولوی فتح علی صاحب کے بیٹے اور رفیع الدین حسین خان صاحب کے نواسے تھے۔

جو صوبہ بہار کے ناظم و رئیس اور عمائدین سے تھے، آپ نانا کے بڑے لاڈلے تھے ...... سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور تقریر سُنی، تو کیفیت بدل گئی، اب وہ عظیم آباد کے بانکے نوجوان نہ تھے، بلکہ سید صاحبؒ کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے، رائے بریلی میں مولانا اسماعیل صاحب شہیدؒ سے حدیث پڑھتے، اور آپ کی جماعت میں آپ کے نائب تھے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور سر پر لاد کر لاتے، اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے، مٹی گارے کا کام کرتے۔

سید صاحبؒ کی جماعت میں آپ سے زیادہ مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ سے کوئی مشابہ نہ تھا، آپ سید صاحبؒ کے رنگ میں ایسے رنگے، اور آپ کی محبت میں ایسے ڈوبے کہ اپنے سارے خاندان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا، اور سید صاحبؒ کا مخلص اور جاں نثار سچا نام لیوا بنا دیا، سید صاحبؒ کے بعد آپ ہی نے سب سے زیادہ آپ کی نیابت و جانشینی کا حق ادا کیا، اور آپ کے خاندان نے سید صاحبؒ کی محبت کی سب سے گراں قیمت اور سب سے بھاری تاوان ادا کیا، آپ کی ترغیب سے خاندان کے سب مرد و زن خورد و کلاں سید صاحبؒ سے بیعت ہو گئے تھے، سید صاحبؒ حج کو تشریف لے گئے تو آپ وطن میں نیابت انبیاء کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر سید صاحبؒ کے ہم رکاب جہاد کے لئے تشریف لے گئے، سید صاحبؒ نے

آپ کو کابل سفارت پر بھیجا!.......... سوات سے سید صاحب نے آپ کو اور مولانا سید محمد علی صاحب[1] کو تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے ہندستان روانہ فرمایا، مولانا ولایت علی پر آپ کی جدائی اور میدان جہاد سے علٰحدگی بہت شاق تھی، سید صاحب نے آپ سے فرمایا کہ مولانا! ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے ہیں، یعنی اس ایک تخم سے ہزاروں درخت پیدا ہوں گے، آپ وہاں سے بمبئی و حیدرآباد (دکن) آئے،......

آپ کو اسی اثنا میں بالاکوٹ کے حادثے کی اطلاع ہوئی، سید صاحب کی خبرِ شہادت سے سارا بار آپ پر پڑ گیا!...... تمام ہندستان میں سید صاحب کے حلقوں میں آپ کی شہادت سے ایک انتشار و پژمردگی چھائی ہوئی تھی،........ آپ نے مطابق آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۤئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ[2] سید صاحب کے کام کو سنبھالا، وطن پہونچ کر تبلیغ دین و تنظیم جماعت کا کام شروع کیا، لوگوں نے آپ کے ہاتھ تجدید بیعت کی!...... آپ ہی کی کوششوں سے حضرت

---

[1] مولانا محمد علی رام پوری (ف ۱۲۵۸ھ) سید صاحب کے چند ممتاز خلفاء میں تھے حالات کے لیے سیرت سید احمد شہید (ص ۳۶۲-۳۵۸) اور سوانح احمدی (ص ۱۵۵-۱۵۰) کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ [2] آل عمران: ۱۴۴ (اور محمد تو بس رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گذر چکے ہیں، سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے)

شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمۂ قرآن اور شاہ اسماعیل صاحب کے رسائل (جو آپ نے شاہ اسحاق صاحب سے دہلی سے منگائے تھے) شائع ہوئے ..... آپ نے اپنے شیخ اور ان کے مخصوص خلفا کی طرح بیسیوں مردہ سنتیں زندہ کیں، اپنے ہاتھ سے خاندان میں متعدد بیواؤں کا نکاح کیا ...... دو برس کے بعد آپ راستہ میں وعظ و تبلیغ فرماتے ہوئے حج کو تشریف لے گئے۔ حج و زیارت سے فراغت کے بعد آپ یمن تشریف لے گئے، اور نجد و عسیر، مسقط، حضرموت کی سیر کی اور قاضی محمد بن علیؒ شوکانی سے حدیث کی سند لی، حج سے واپسی کے بعد مجاہدین کی طلب پر آپ نے اپنے بھائی مولوی عنایت علیؒ صاحب کو گلاب سنگھ کے مقابلہ کے لئے سرحد بھیجا، کچھ عرصہ کے بعد خود تشریف لے گئے ..... گلاب سنگھ نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا اور ان کی حمایت حاصل کی، انگریزوں نے مفتوح ملک میں غدر کرا دیا اور آپ کے عمال قتل کر دیئے گئے۔

اس کے بعد آپ وطن لوٹنے پر مجبور کر دیئے گئے، لیکن انہیں واپسی کا بڑا رنج و ملال تھا، آخر دو برس کے قیام کے بعد پھر ستھانہ پہنچ گئے، اور وہیں محرم ۱۲۶۹ھ میں علم و عمل کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

"مولانا علیہ الرحمۃ کا پورا خاندان صادق پور، سید صاحبؒ کے سچے معتقدوں اور اسلام کے پکے مجاہدوں کا خاندان تھا، جس کا بچہ بچہ سید صاحبؒ کی محبت میں چور اور اسلام کے لئے سر بکف تھا۔

ان لوگوں نے فرداً فرداً اور بحیثیت مجموعی سید صاحبؒ کی وفاداری اور اسلام کی جاں نثاری کا ایسا حق ادا کیا، جس کی نظیر کسی دوسرے خاندان میں نہیں ملتی، مولانا عنایت علی غازیؒ[1]، مولانا فرحت حسین[2] صاحب، مولانا احمد اللہ[3] صاحب، مولانا یحییٰ علی[4] صاحب میں سے ہر ایک اپنے وقت میں امام احمد بن حنبل کا نمونہ تھا!......

یہ لوگ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ[5] کے پورے مصداق تھے، مقدمہ سازش[6] میں حکومت نے ان کے مکانات مسکونہ تک مسمار کر دیے اور صادق پور کا وہ محلہ جہاں محل کھڑے تھے، کف دست میدان بنا کر اور مکانوں پر ہل

---

[1] مولانا عنایت علی صاحب غازیؒ (مولود ۱۲۰۷ھ یا ۱۲۰۸ھ) کی وفات سرحد پار (تنگل قـ ایسے روح فرسا حالات میں ہوئی (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) کہ دشمن بھی سن کر آب دیدہ ہو جائے، کوئی مصیبت نہ تھی جو اس مرد غازی نے خوشی خوشی برداشت نہ کی ہو۔ (تذکرہ صادقہ ص ۱۳۰-۱۴۰) مولانا نے ان کے ابتلا و محن کو بھی غلط معنی پہنائے ہیں، فاشکو بثی وحزنی الی اللہ، ممکن ہے آگے کسی سلسلے میں ذکر آ جائے، [2] مولود ۱۲۲۶ھ متوفی ۱۲۷۴ھ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ صادقہ (ص ۱۳۵-۱۴۱)

[3] اسیر انڈمان و متہم مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء، انڈمان ہی میں وفات پائی؛ ۱۲۹۸ھ، (تذکرہ صادقہ ص ۵۹-۴۴) [4] اسیر انڈمان و متہم مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء، اسی "زندان" میں واصل بحق ہوئے؛ ۱۲۸۴ھ (تذکرہ صادقہ ص ۷۸-۶۳) [5] آل عمران: [illegible] (سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیے گئے میری راہ میں) [6] مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء

چلوا کر میونسپلٹی کی عمارت بنوا دی جو آج تک قائم ہے (البتہ زلزلے کے بعد دوبارہ تعمیر ہوئی ہے، لیکن Established 1865 کی تاریخ درج ہے) اور قدیم تعمیر کی ایک ایک یادگار اور ایک ایک نشانی مٹا دیا، قبریں بھی مشتبہ کہہ کر کھود کر پھینک دی گئیں حتیٰ کہ کھجور کا ایک درخت رہ گیا تھا جو اس چمن خزاں دیدہ کی یادگار تھا، اس کو بھی اکھڑوا دیا'......

(سیرت سید احمد شہید ص ۳۷۲-۳۶۳ ملخصاً)[1]

مولانا ولایت علی صادق پوری پر انشقاق جماعت کے بعد دوسرا الزام اعتقاد غیبوبت کا ہے اور اسے مولانا سندھی نے بڑے شدومد کے ساتھ اچھالا ہے، بلکہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ان کا مرکزی فکر ہی یہی عقیدۂ غیبوبت تھا، اور اسی لئے وہ مولانا محمد اسحاق سے علیحدہ ہوئے، مولانا نے اس الزام کو بار بار دہرایا ہے، ہم صرف دو ایک اقتباس دیں گے:-

(۱) واقعہ بالاکوٹ میں بقیۃ السیف مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہیں ملا، اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ سکھوں نے امیر شہید کا سر کاٹنے کے بعد مقامی مسلمانوں کی معرفت فوجی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کرا دیا تھا'...... اس اضطراب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ (ص ۱۹۲)

---

[1] مزید تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ صادقہ (ص ۱۳۰-۱۱۰) اور سوانح احمدی (ص ۱۶۷-۱۵۵)

(۲) بعض اتفاقی واقعات اس کے مؤید بن گئے' امیر شہید بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز پیشتر اپنے اصحاب کو وصیت کرتے رہے ہیں کہ اگر بالفرض کسی ضرورت کے لئے ہم چند روز غائب ہو جائیں تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں گے'........ (ص ۱۹۳)

(۳) مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق صدر حمید کا اصلاحی فکر قبول نہیں کیا' اور اس روایت غیبوبت کی آڑ میں اپنی مستقل جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا'........ جس وقت الصدر الحمید دہلی سے حجاز پہنچ گئے' اس کے بعد مولانا ولایت علی نے پٹنہ میں اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا' (ص ۱۹۴)

(۴) اس پارٹی کا مرکزی فکر یہی بتایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصہ کے لئے غائب ہو گئے ہیں' ان کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیے' وہ ضرور آئیں گے' اور انہی کی جماعت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے'

(۵) بظاہر یہ فکر نہایت غیر معقول ہے' مگر بڑے بڑے عالموں اور صوفیوں کا جو حزب ولی اللہ سے اختصاص رکھتے ہیں' اس تحریک کی شمولیت میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے' اس لئے اس کی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ عوام (نہ خواص) کو تحریک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لئے یہ ایک سیاسی چال تھی' (ص ۱۹۵)

پہلے دو ٹکڑے تمہیدی ہیں' ان سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں' تیسرے اقتباس

میں کچھ اضافوں کے ساتھ "انشقاق جماعت" والے الزام کو دہرایا گیا ہے اس میں ایک نفرہ (بروایت غیبوبت کی آڑ میں) مولانا ولایت علی کی دیانت داری اور خلوص نیت پر ایسا بدنما حملہ ہے جس سے ہم مولانا عبید اللہ کو اونچا دیکھنا چاہتے تھے، البتہ انشقاق جماعت کے متعلق ایک نئی بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے حجاز پہنچنے (۱۲۵۸ھ) کے بعد مولانا ولایت علی نے اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا" اس کے متعلق دو حرف جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے ماننے والوں کی طرف سے پارٹی "یا مستقل پارٹی کا اعلان کبھی نہیں ہوا، ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا، رہی مولانا ولایت علیؒ کی جہادی اور تنظیمی سرگرمیاں، تو وہ دکن سے واپسی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں، (۱۲۴۸ھ) اسی سال سید صاحبؒ کے ماننے والوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تجدید کی، (جیسا کہ اوپر گذر چکا) اس تجدید بیعت کے بعد مولانا اسحاقؒ دس سال ہندستان میں رہے، اور مولانا ولایت علی کی سرگرمیاں جاری تھیں، صرف پورب میں نہیں بلکہ سرحد پار بھی، تجدید بیعت کے چند ہی سال بعد سید ضامن شاہ نے (جو گلاب سنگھ والی کشمیر سے برسر جنگ تھا) آپ سے مدد طلب کی، آپ نے اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علیؒ غازی کو بالاکوٹ بھیج دیا۔ اور وہ وہاں پہلے فتحیاب ہوئے (۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء) پھر خوانین کی غداری سے بے یار و مددگار ہو کر وطن واپس چلے آئے (تذکرہ صادقہ ص ۱۳۶) تو کیا مولانا محمد اسحاقؒ کو ان سرگرمیوں کی خبر نہیں تھی؟ پھر مولانا کا یہ لکھنا کہاں تک صحیح ہے کہ مولانا اسحاقؒ کے حجاز پہنچنے کے بعد مولانا ولایت علیؒ نے

اپنی پارٹی کا اعلان کر دیا؟ مولانا محمد اسحٰق کی دہ سالہ (۱۲۴۵ھ تا ۱۲۵۵ھ) (۱۸۳۲ء تا ۱۸۴۲ء) خاموشی اور رضامندی سے شاید ہمارے مولانا اپنی کمزوری محسوس کرتے ہیں، اسی لئے انہوں نے "بعد از ہجرت" کا شاخسانہ لگایا، اور شاید اسی لئے ایک دوسری جگہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مولانا محمد اسحٰق کے احترام (اور خوف) سے وہ لوگ دہلی اور اس کے اطراف میں صاف صاف اپنی تبلیغ نہیں کرتے تھے۔[1]

یہ دہلی اور اس کے اطراف کا کیا ذکر ہے؟ بنگال سے لیکر کشمیر، سندھ اور سرحد پار تک ان کے مبلغین سرگرم عمل تھے، وَمَا يَوْمُ حَلِيمَةَ بِسِرٍّ (اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں)

اب مسئلہ غیبوبت کو لیجئے جسے مولانا نے بار بار بڑے شد و مد کے ساتھ اچھالا ہے، حالانکہ یہ ایک وقتی چیز تھی جس سے بعض طبیعتیں متاثر ہوگئی تھیں، اسے "مرکزی فکر" کہنا یا دعوت کی اساس بتانا مبالغہ آرائی سے کام لینا ہے۔

بات اتنی ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت سے مجاہدین کے جی چھوٹ رہے تھے، کسی نے یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ "سیدنا" شہید نہیں ہوئے، غائب ہو گئے ہیں، تھکے ہارے اس پر یقین کر بیٹھے، اور کچھ دنوں تک اس کا غلغلہ رہا۔ بعد کو رفتہ رفتہ طبیعتیں سکون پر آئیں تو غلطی کا احساس ہوا، پھر اس میں صادق پور اور غیر صادق پور کی تفریق نہیں، سید صاحبؒ کی غیبوبت کے عقیدے کا ظہور ان کے

---

[1] کتاب التمہید میں ارشاد ہوا ہے: "...... لکن بسبب احترام الصدر محمد اسحاق ما کانوا یجاھرون بالدعوۃ فی دھلی واطرافہ (؟)" (ص ۱۹۱ بحوالہ کتاب التمہید)

محبین خاص کے تمام حلقوں میں ہوا، اہل صادق پور اس سے الگ نہیں تھے، اور یہ امر شدت محبت میں بہ کثرت ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حال وقال سے ظاہر ہے جو وفات نبوی کے وقت پیش آگیا، خود دہلی اور سہارنپور کے نواح میں بھی اس کا غلغلہ رہا، اور تو اور مولانا کے حزب دہلوی (دیوبندی) کے مرکز میں بھی اس کا چرچا تھا، اور اساطین ائمہ حزب دہلوی اس کے راوی ہیں، مولانا حکیم سید عبد الحی (ف ۱۳۴۱ھ) رقم طراز ہیں:-

"اس کے بعد کچھ حضرت سید صاحب کے غیبوبت و ظہور کا ذکر ہوا، ان سب لوگوں نے اس بے بضاعت سے پوچھا، میں نے کہا اس میں تو شک نہیں کہ سید صاحب نے اس قسم کی پیشین گوئیاں فرمائی تھیں، لیکن وقوع میں اب تک اشتباہ ہے، مولوی محمود حسن صاحب نے فرمایا، یہی ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا مسلک ہے، پھر ان لوگوں نے نہایت معتبر ذریعہ سے یہ قصہ سنایا، اور سب حاضرین نے اس پر اتفاق کیا:-

حدثنا الشیخ الصالح محمود حسن والحافظ احمد بن مولانا محمد قاسم والمولوی حبیب الرحمن وکلہم ثقۃ قالوا حدثنا شیخنا الثقۃ الصدوق الحجۃ مولانا رشید احمد الگنگوہی حدثنا الشیخ الزاہد المتقی الاورع الحجۃ مولانا مظفر حسین الکاندھلوی قال سمعت

یعنی حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی زبانی سنا، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے سید صاحب کی زبان سے دس پیشینگوئیاں سنیں، نو ان میں سے واقع ہو چکی ہیں، اور ایک باقی ہے وہ پیشینگوئی آپ

من شیخنا و مولانا السید احمد عشرۃ
امور وقعت منہا تسعۃ وبقیت
واحدۃ وھو غیبوبتہ وظہورہ
رحمۃ اللہ علیہ، واللہ اعلم۔

کی غیبوبت اور ظہور کے بارے میں ہے
.... الخ الخ
(ارمغان احباب: معارف جلد ۱۴ ص

جب مولانا مظفر حسین کاندھلوی (جو مولانا محمد اسحاق کے شاگرد، اور مولانا سندھی کے حزب دہلوی کے ائمہ اولین اور دہلی بورڈ کے ارکان اربعہ میں سے ہیں، ص ۱۸۲، ۱۸۳ حاشیہ، ف ۱۲۸۳ھ) جیسے بزرگ روایت غیبوبت کے راوی ہوں، اور اس کا چرچا اہل علم کے دہلوی مرکز میں ہو تو پھر مولانا ولایت علیؒ اور اہل صادق پور پر یہ عتاب خاص کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان سے لغزش ہوئی، اور یہ فرط محبت کی لغزش تھی، اس خیال کو مرکزی فکر یا عقیدے کی حیثیت کبھی نہیں حاصل ہوئی، اور نہ وہ (معاذ اللہ) اس کے آڑ میں کوئی پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے، اللہ کے یہ برگزیدہ بندے اس سے بہت بلند، اور ان کی سیرت ان چھچھوری باتوں سے پاک اور بے داغ تھی، افسوس یہ ہے کہ ہمارے مولانا اپنی وسعت نظر اور جہاں بینی کے باوجود، اہل صادق پور کے حالات و افکار سے بہت سرسری واقفیت رکھتے ہیں جس کا انہیں خود بھی اعتراف ہے:-

"جس تفصیل کے ساتھ ہم دہلوی (دیوبندی) پارٹی کے حالات جانتے ہیں، اس قدر (صادق پور) پٹنہ کی تحریک سے آشنا نہیں، تتمیم مبحث کے لئے ہم دوسری پارٹی کے مجمل حالات بیان کرتے ہیں"۔ (ص ۱۹۰)

اے کاش! کہ یہ مجمل حالات صحیح ہوتے،

ہمارے مولانا کے ہاں تعارض بھی عجیب و غریب ہے "عقیدہ غیبوبت کے متعلق ایک جگہ (ص ۱۹۵) اقتباس اوپر گزر چکا ہے، لکھا ہے کہ اس پارٹی کا مرکزی فکر یہی بتایا جاتا ہے" دوسری جگہ جزم کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

وکان الاصل السیاسی للصادق پوریین اعتقاد غیبوبۃ الامیر الشہید[۱] (عقیدہ غیبوبت کو صادق پوریوں کے سیاسی اصل (مرکزی فکر) کی حیثیت حاصل تھی،

اور تیسری جگہ "کلمہ حق" زبان سے نکل جاتا ہے:

"....... مولانا ولایت علی نے ہندستان کے مشرقی حصہ پر اپنا اثر قائم کرلیا، اور افغانی پہاڑوں میں ....

......، اپنا مستقل مرکز بنایا، ان کی اولاد اب تک اس علاقے میں اپنی امارت اور اپنا مرکز رکھتی ہے۔ مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے، کہ وہ ایک چھوٹے پیمانہ پر امیر شہید کی حکومت موقتہ کی یادگار ہے

ہمارا اپنا خیال مولانا ولایت علیؒ کی تحریک کے متعلق یہ ہے کہ وہ مولانا شہید کی اصل خاص جماعت کو زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور اسی لئے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن خان جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں"۔ (ص ۱۹۶)

خط کشیدہ فقروں میں مولانا نے جو کچھ کہا ہے، اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہتے، البتہ اتنی ترمیم[۲] کے ساتھ کہ وہ سید شہیدؒ اور مولانا شہیدؒ دونوں کی مشترکہ

[۱] صفحہ ۱۹۱

[۲] اس ترمیم کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ہمارے مولانا نے مولانا ولایت علیؒ کو محض آمین و رفع یدین والی اہل حدیث جماعت کا رہبر سمجھنے میں جیسا کہ ان کے بعد کے جملے (اور اسی لئے) سے مترشح ہوتا ہے .... (حاشیہ)

خاص جماعت کو زندہ کرنا چاہتے تھے، اور اس میں وہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بڑی حد تک کامیاب ہوئے، گو جان و مال کی بازی لگا کر، نتیجہ کیا ہوا، اسے نہ پوچھئے:۔

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہ کن ۔۔۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔۔۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

غیبوبت سے متعلق دو حرف اور مولانا کو صادق پور کے لٹریچر پر اطلاع نہیں، ورنہ انہی کی تحریروں سے اس کی جھلک[1] مل جاتی اور نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) اور مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (ف ۱۳۲۹ھ) کی شہادتوں کی ضرورت نہ پڑتی، مگر جب پیش کی جا چکی ہیں، تو ان کی چھان پھٹک ضروری ہے، نواب صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"جمعے از عظیم آباد و بنگالہ دربارۂ سید احمد بریلوی مرحوم نیز ایں گمان کردہ اند، تا آنکہ بعض از مریدانِ ایشاں جہل حدیث دریں باب جمع نمودہ و ایشاں را ۱"

حالانکہ یہ واقعہ کے سراسر خلاف ہے، مولانا ولایت علی سید صاحب کی جماعت مجاہدین کے رہنما تھے، اور ان کے خاندان کا مرکزی فکر صرف جہاد رہا، اہل حدیثیت تو ان کے ہاں بہت بعد میں آئی ہے، ان میں سے اکثر اپنے کو حنفی مع القول بالترجیح کہتے تھے، مولانا عبد الرحیمؒ تک یہی مسلک تھا، (دیکھو: تذکرہ صادقہ ص ۱۹، ۱۷ ۔ ۱۱)

[1] عقیدۂ غیبوبت کو اہل صادق پور کے ہاں کوئی ایسی اہمیت نہیں تھی کہ اس کی تبلیغ کی جاتی، ایک خیال تھا، جس سے کچھ دنوں تک بعض حضرات متاثر رہے، ان کے بعض رسالوں میں اس تاثر کا دھندلا سا نشان ملتا ہے۔

چہل حدیث دریں باب جمع نمودہ وایشاں را مہدی وسط قرار دادہ قائل بغیوبت ایشاں در جبال متربیہ ہند شدہ منتظر عود بودہ اند وایں زلّتِ عظیم است وکیف کہ سید مرحوم ایں دعوی نہ کردہ وایما بعود نہ نمودہ واگر می کرد، ہیچ کس تصدیق نہ می نمود۔" (ص ۱۹۳ حاشیہ)

نواب صاحب (جنہیں مولانا سندھی، مولانا ولایت علی کا ہم مسلک بھی بتاتے ہیں: ص ۱۹۶) کے اس بیان میں ایک بات تو بالکل بے بنیاد ہے، "الاربعین فی المہدیین" جس کا اوکنلے وغیرہ نے بھی ڈھنڈورا پیٹا ہے، اس وقت ہمارے سامنے ہے،[1] ہم نے اسے بار بار شروع سے آخر تک دیکھا، کہ شاید کہیں سید صاحبؒ کا نام آگیا ہو، یا ان کی مہدویت کی تبلیغ کی گئی ہو، لیکن اس میں ایک حرف بھی ایسا نہ ملا، جس سے نواب صاحب اور دوسروں کے عاید کردہ الزام کی تائید ہوتی ہو، یہ "چہل حدیث" کا ایک مجموعہ ہے، جس میں صرف خروج مہدی سے متعلق حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں، اس کے مرتب خود مولانا ولایت علیؒ صاحب ہیں،

---

[1] ہمیں بڑی تلاش سے مولانا ولایت علی کے نو رسالوں کا ایک مجموعہ (مجموعہ رسائل تسعہ) دیکھنے کے لئے ملا، اسی میں تیسرا رسالہ "اربعین فی المہدیین" ہے، ایک کالم میں اصل رسالہ ہے، اور برابر کے کالم میں مولانا الٰہی بخش صاحب بڑاکری بہاری (ف ۱۳۴۲ ہجری) کے قلم سے اردو ترجمہ ہے، مطبع فاروقی، دہلی میں چھپا تھا، (تاریخ طباعت درج نہیں)۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ یہ رسالہ "اربعین" ..... ہے اور انہوں نے اسے دیکھا ہے، وہ خرافات کا مجموعہ ہے، (برہان مئی ۱۹۴۳ء مکتوب: مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۳ء) اگر یہ صحیح ہے تو پھر جاہلوں کے اس فعل سے مولانا ولایت علی پر کیا الزام آتا ہے۔

اور انھوں نے حدیثوں کے جمع کرنے کے سوا اپنی طرف سے ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ شروع شروع بڑی حیرت ہوتی ہے، کہ نواب صاحب جیسے عالم کو ایسی جرأت کیوں کر ہوئی؟ لیکن جو لوگ ان کی زندگی کی الجھنوں سے واقف ہیں، وہ انھیں معذور رکھیں گے، دیکھیے تو کس انداز سے "جمعے از عظیم آباد و بنگالہ" کہتے ہیں، گویا مولانا اولاد حسنؒ قنوجی (ف ۱۲۵۳ھ) خلیفہ حضرت سید شہیدؒ کے فرزندِ دلبند کو اس کی بھی خبر نہیں تھی، کہ روایت شہادت میں اختلاف کیوں کر پیدا ہوا؟ اور اس میں خود سید صاحبؒ کے گھر والوںؓ اور اہل قافلہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ اور پھر جہیل حدیث کے انتساب میں "بعض از مریدان ایشان" کہ کر چپ ہو جاتے ہیں، حالانکہ مولانا ولایت علیؒ مرحوم کی گود میں وہ کھیل چکے ہیں، اور انھی کی ترغیب سے نواب صاحب نے بلوغ المرام کی طرف توجہ کی اور شرحیں لکھیں۔[۲]

---

[۱] مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں :۔

"سید صاحبؒ کی چھوٹی بیوی صاحبہ جن سے قبل از معرکہ بالاکوٹ سید صاحبؒ نے اپنی غیبوبت کی پیشین گوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اقربا اور اہل قافلہ آپ کی غیبوبت کے قائل تھے، مگر پنجاب اور ہندستان کے اکثر آدمی پلہ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں"۔

(سوانح احمدی: ص ۱۳۷، نیز ملاحظہ ہو: سیرت احمد شہید ص ۲۲۳، ۲۳۰)

[۲] "..... پھر مولوی ولایت علی مولوی عنایت علی قنوج میں تشریف لائے میرے مکان پر آئے اپنے اہل بیت کو واسطے ملاقات والدہ مرحومہ کے بھیجا، جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا،

اصل یہ ہے کہ وہ حکومت کے سامنے اپنے کو عظیم آباد اور صادق پور سے
ل بے تعلق دکھانا چاہتے تھے، اور یہی ہو کر رہا، اب رہ گئی، مولانا شمس الحق صاحب
یم آبادی کی تحریر جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:۔

حر اکثر العوام وبعض الخواص فی حق	اکثر عوام اور بعض خواص امام امجد غازی
ازی الشهيد الامام الامجد السيد	شہید حضرت سید احمد بریلوی رضی اللہ عنہ
البریلوی رضی الله عنہ انه المهدی	کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں، کہ وہ مہدی
(؟ الموعود) وانه لم يستشهد	موعود ہیں، ور میدان جنگ میں شہید نہیں ہوئے
معرکۃ الغزو بل انه اختفی عن أعین	بلکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں،

ٹ کا بقیہ) مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا، اس وقت میں بارہ تیرہ برس کا
ا گا، اس کہنے کا نتیجہ بعد ایک مدت دراز کے یہ ظاہر ہوا کہ میں نے بلوغ المرام کی شرح لکھی،....."
(القاء المنن بالقاء المحن صـ ۱۲)

نواب صاحب کا حال کچھ فرقہ ملامتیہ کا سا ہے، اہل نجد کی بھی کوئی برائی نہیں ہے جو انھوں نے
کتابوں میں نہ کی ہو (اتحاف النبلاء صـ ۱۶-۴۱۳، التاج المکلل، موائد العوائد وغیرہ) اور یہ صرف
ہابیت سے برأت کے لئے، ورنہ وہ دل سے نجد کی دعوت توحید کے معترف اور ثناخواں ہیں، (اتحاف
۴۸) کچھ یہی حال ان کا اہل صادق پور کے ساتھ ہے، ایک مرتبہ کلکتہ سے واپسی میں ملنے کی
ہش ہوئی تو دانا پور میں غلس کے وقت علمائے صادق پور کو آنے کی تاکید کی کہ کراماً کاتبین کو خبر
ملاقات ہوئی، باتیں ہوئیں، مگر اس حال میں کہ ہر آن رقیبوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔
(بروایت مولانا عبدالغفار صادق پوری)

الناس وهو حیٌّ موجود فی العالم ...... اور وہ اب تک زندہ ہیں) ......

...... (ص ۹ - ۱۹۸) ......

"بعض الخواص" پر مولانا سندھی نے یہ حاشیہ دیا ہے :-

قلت مرادہ من بعض الخواص الشیخ	(بعض خواص" سے مشہور عالم امیر ولایت علی
الجلیل الامیر ولایت علی المذکور دعا	ممدوح مراد ہیں جنھوں نے اس عقیدہ
الی ھذہ العقیدۃ دعوۃ حثیثۃ	کی سرگرمی کے ساتھ تبلیغ کی)

ص ۱۹۸ (حاشیہ)

یہ مولانا کی زبردستی ہے، مولانا ولایت علیؒ نے کبھی اس عقیدہ کی تبلیغ نہیں کی، سرگرمی کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، ان کی دعوت صرف جہاد اور احیائے سنت کی تھی، مزید براں قرینے ایسے ہیں کہ مولانا شمس الحق (ف ۱۳۲۹ھ) کی طرف ہو نہیں سکتا، ہمارے شمس المحدثین کی پیدائش ۱۲۷۳ھ میں ہوئی، ان کا خاندان صادق پور سے کبھی کسی طرح وابستہ نہیں رہا، خود ان کی تعلیم و تربیت صادق پور کے اثرات سے بہت الگ ہوئی، وہ مولانا بشیر الدین قنوجی (ف ۱۲۷۳ھ) اور میاں سید نذیر حسین محدثؒ (ف ۱۳۲۰ھ) کے شاگرد اور ہم مشرب تھے، غیبوبت کا عقیدہ یا خیال اگر کہیں تھا بھی، تو اندر اندر، اور شمس المحدثین کے شباب تک تو وہ اند[ر]

لہ تراجم علمائے حدیث ہند (ص ۳۲۹) میں مولانا بشیر الدین قنوجی کا سال وفات ۱۲۷۳ھ [لکھا] گیا ہے جو صحیح نہیں ہو سکتا، مولانا شمس الحق (مولود ۱۲۷۳ھ) ان کے شاگرد ہیں، نیز وہ نواب صدیق حسن خان صاحب کے دور میں بھوپال کے قاضی رہے ہیں، صحیح سنہ نہیں معلوم ہو سکا۔

عقیدت ختم ہو چکی تھی، اور رہ گئی تھی تو بالکل برائے نام اور ایک محدود دائرے کے اندر، ان حالات میں ان کے لئے مولانا ولایت علیؒ (جو ان کی ولادت سے چار سال پہلے جان، جان آفریں کو سپرد کر چکے تھے) کے خیالات کا پتہ لگانا بہت دشوار تھا، اس کے علاوہ ہمارے پاس ایسی زبانی شہادتیں ہیں[۱]، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عون المعبود کی مندرجہ بالا عبارت میں مولانا کا اشارہ اپنے ایک عظیم آبادی معاصر کی طرف تھا، جو ایک جید حنفی عالم تھے، اور شمس المحدثین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا عنایت علی غازیؒ کے ابتلا و محن، اور ان کی جماعت کی ابتری کو بھی مولانا سندھی عقیدۂ غیبوبت ہی کا شاخسانہ بتاتے ہیں، جس کی وجہ صرف لاعلمی ہے۔

فقام مقامہ الامیر عنایت علی لکن	(پھر ان کی جگہ مولانا عنایت علیؒ نے لی لیکن جہاد و قتال پر
ما حصل الاتفاق علی الجهاد والقتال	اتفاق نہ ہو سکا، بلکہ لوگ منتظر بیٹھے رہے (یعنی سید صاحبؒ
بل جلسوا منتظرين فتوفی سنة ۱۲۷۳	کی واپسی کے) ان کا انتقال ۱۲۷۳ھ (؟) میں ہوا)
	(۱۲۷۴؟) (ص ۱۸۱)

---

[۱] ابھی مولانا شمس الحق مرحوم کے دیکھنے اور سننے والے بیسیوں اہل علم موجود ہیں، جن میں سے بعض یا حضرت کی خدمت میں اس خاکسار کو نیاز حاصل ہے، اور ان میں سے اکثر سے راقم نے اس موضوع پر گفتگو کی، اور ہر ایک نے اس بات کی تائید کی کہ شمس المحدثین کا اشارہ مولانا ولایت علی کی طرف نہیں ہو سکتا۔

غالباً ان کا نام مولوی محمد عظیم تھا، مجھے جو بزرگ کے واسطے سے یہ روایت پہنچی انہوں نے نام لینے سے انکار کیا۔

لکن حدث فی اصحاب الامیر عنایت علی	لیکن مولانا عنایت کی جماعت میں کچھ ایسے لوگ
جمع من المجاہدین مالم یقوم علی	پیدا ہوگئے، جو اس عقیدے میں ان کے ساتھ
ھذا الاصل بل مالوا الی الدھلویین۔	رہ سکے، بلکہ ان کا رجحان دہلویوں کی طرف

(ص ۵۵)

جس المناک واقعہ کو مولانا نے عقیدۂ غیبوبت کا شاخسانہ بتایا ہے
کی اصلیت بھی معلوم کر لیجیئے :۔

"جب مولانا ولایت علی کا بماہ محرم ۱۲۶۹ھ موضع ستھانہ ملک سوات میں انتقال ہوگیا تو آپ (یعنی مولانا عنایت علی) منگل تھانہ سے وہاں واپس آئے اور باتفاق تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی اور جب تک سید اکبر شاہ کی اولاد (سید مبارک، سید عمر، سید عمران، سید علی) نے فقراء مجاہدین کے ساتھ بے وفائی نہیں برتی، وہیں قیام فرمایا، پھر بحالت مجبوری مع مجاہدین منگل تھانہ واپس آکر مسکن گزیں ہوئے اور باقی زندگی قلیل مجاہدین کے ساتھ وہیں ختم کر دی"

"۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پر خطر تھی، شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا، اطاک تہلکہ میں تھے ..... پھر کس کو ہوش تھا، اور کیوں کر ممکن تھا کہ سرحد پار فاقہ کشوں کے لیئے کوئی سامان کیا جا سکتا[1]، مسلسل فاقہ کشی نے حالت

---

[1] یہ وہ لکھ رہا ہے، جو سرحد پار مجاہدین کے لئے روپیہ اور سامان فراہم کرنے والوں کا سرگروہ ومعاون تھا۔ یعنی مولانا عبدالرحیم صادق پوری برادر زادہ مولانا ولایت علی و مولانا عنایت علی ملزم مقدمہ سازش انبالہ واسیر پورٹ بلیر)

تباہ کردی، درختوں کی کونپلوں اور پتیوں پر اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی، چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی، اجابتیں خون آلود ہونے لگیں، آپ کے پاس جو نقود تھے، آپ مہاجرین و انصار پر صرف کر چکے تھے، اور وہ تھا ہی کیا، اونٹ کے منہ میں زیرہ، اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے، زندگی تلخ تھی، یہ وقت تھا کہ اگلی امم مضطر ہو کر متی نصر اللہ پکار اٹھی تھی، مگر اس صبر و استقامت کے کوہ نے نہایت حلم و رضامندی کے ساتھ اللھم بالرفیق الاعلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضہ بخار و ضیق النفس سنہ ۱۲۷۲ھ کے آخر میں (مطابق سنہ ۱۸۵۶ء) بعمر ۵۰ سال مع المومنین سے جنت نعیم کو رحلت کی، اللھم اغفرلہ وارحمہ واحشرہ فی زمرۃ المہاجرین الذین ھاجروا وجاھدوا مع نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم"

(تذکرہ صادقہ ص ۸۰، ۱۳۰)

ان روح فرسا حالات میں اگر مجاہدین انگریزی علاقہ پر کوئی حملہ نہ کر سکے یا خود ان کی جماعت میں کچھ اختلال پیدا ہو گیا، اور امیر کی اطاعت سے کچھ لوگ منحرف ہو گئے، تو اسے غلط معنی کیوں پہنائے جائیں؟

"انشقاق جماعت" اور "مسئلہ غیبوبت" کے علاوہ مولانا ولایت علی کا ایک بڑا جرم یہ بھی ہے کہ انھوں نے نجد و یمن کی سیاحت کی، اور امام محمد بن علی شوکانی (ف سنہ ۱۲۵۰ھ) سے روایت حدیث کی سند و اجازت لی (ص ۱۳۳، ۱۹۱)

ہم پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، کہ بیرون ہند کے اہل علم سے استفادہ کرنا کوئی جرم

نہیں، اسلام اس قسم کی جغرافیائی حد بندیوں کا قائل نہیں، خود حضرت شاہ ولی
صاحب (ف ۱۱۷۶ھ) نے مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر کردی مدنی (ف ۱۱۴۵ھ
سے تعلیم حاصل کی، مولانا عبدالحئی بڑھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) نے سفر حج کے
موقع پر امام شوکانی سے خط و کتابت کی اور ان کی تصنیفات حاصل کیں۔
(سیرت سید احمد شہید، ص ۳۲۰) اور مولانا کی روایت کے مطابق (ص ۴۸ احا
مولانا شہید نے بھی نجدیوں کے پاس اپنا نامہ بھیجا تھا، تو پھر مولانا ولایت علی
ہی کیوں گنہگار قرار دیئے جائیں؟

ایک ضروری بات رہ گئی جسے آخر میں عرض کر دینا چاہتا ہوں، مولانا
نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ ان کی دہلوی یا دیوبندی پارٹی اپنے نجدی و مہدی
مخالفوں کو چھوٹا رافضی کہہ کر پکارتی تھی، پتہ نہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے
ہمیں امید نہیں کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی (ف ۱۲۹۷ھ) اور مولانا رشید احمد گنگو
(ف ۱۳۲۳ھ) جیسے متورع عالم اپنے اہل حدیث اور غیر حنفی معاصروں پر ایسے
الزام دھرتے ہوں گے، کم از کم راقم کی طبیعت اسے قبول نہیں کرتی، بہرحال
حزب دہلوی (دیوبندی) کے ترجمان مولانا سندھی رقم طراز ہیں:۔

"مدرسہ دیوبند پہلی درسگاہ ہے جس نے فتح دہلی کے بعد اس اصول پر کام
شروع کیا، دیوبندی نظام نے پچاس سال میں جس طرح کامیابی حاصل
کی ہے، وہ اس تجدید کی صداقت کے لئے شاہد عدل ہے"۔

اس نظام کو پختہ بنانے کے لئے عوام کو بتلایا گیا کہ جس قدر رمنافقہ
حنفی اور ہندوستانی تصوف چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ حقیقت میں

شیعہ پارٹی کا کام کرتے ہیں، اس زمانے میں حزب ولی اللہ کا متوسط طبقہ ہر ایسے انسان کو جو فقہ اور تصوف کا انکار کرتا "چھوٹا رافضی" کہتا رہا ہے، (ص ۱۸۰، ۱۷۸)

ہم نہیں جانتے کہ موجودہ دیوبندی نظام سے تعلق رکھنے والوں میں کتنے افراد مولانا کے اس بیان[1] سے اتفاق کر سکیں گے؟ بہر حال اتنا ہم جانتے ہیں کہ ان کی بڑی تعداد

ع سعدی از دست خویشتن فریاد

پکار اٹھے گی،

اس پر ایک مختصر سا حاشیہ بھی ہے، جس میں حضرت سید شہیدؒ کو بھی اس گندگی میں شریک کرنے کی کوشش کی گئی ہے:-

"چھوٹا رافضی، شاہ اسحاق کے متبعین جس کو اس قسم کا پاتے، عوام سے کہتے کہ یہ چھوٹا رافضی ہے، یہ جملہ دراصل امیر شہیدؒ کا بنایا ہوا ہے،"

---

[1] ان سطروں کو پڑھ کر مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

"جب سے اس پارٹی میں امام عبدالعزیز کے طریقے سے انکار کا غلو پھیلا ہے عوام میں ایک طبقہ ائمہ فقہا کو سب و شتم کرنے والا پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں لوگوں کو چھوٹا رافضی کہا جاتا تھا، حاشا و کلا اس پارٹی کے کسی محترم رکن کو اس قسم کا الزام نہیں دیا جا سکتا...." (برہان مئی ۱۹۵۹ء)

گویا آپ عام اہل حدیث حضرات پر ایک نادر الزام رکھ کر انہیں "چھوٹا رافضی" کا لقب دینا چاہتے ہیں، عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے؟

مگر کثرت سے استعمال اس کا شاہ اسحٰق کے متبعین نے کیا۔"

ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرت سید شہیدؒ پر ایک صریح بہتان ہے، سید صاحبؒ اور ان کے مخصوص اصحاب کا کیرکٹر بہت بلند رہا ہے اور "کفِ لسان" تو ان کی خاص خصوصیت رہی ہے۔

تمام اہلِ حدیث حضرات سے عام طور پر اور اہلِ صادق پور سے خاص طور پر مولانا سندھی کو یہ شکایت ہے کہ وہ بیرونِ ہند (نجد و یمن) کی تحریکوں سے متاثر ہو کر، شاہ صاحبؒ کے طریقے سے الگ ہو گئے۔ یہ شکایت متعدد جگہوں پر مختلف پیرایے میں دہرائی گئی ہے۔ (ص ۱۴۰، ۱۲۹) ان سب میں بڑ
کا بند یہ ٹکڑا ہے:-

"...... لکن بعدما اشتبك بعض ائمة الصادق پوريين مع الظاهرية والمحدثين وزيدية اليمن وحنابلة النجد (؟ نجد) وخرجوا عما كان عليه الصدر الشهيد حدث الاختلاف الكثيرين (؟) العلوم والمعارف بين الحزبين.... (ص ۱۳۳)

(لیکن جب بعض صادق پوری رہنما اہلِ ظاہر، محدثین، یمن کے زیدیوں اور اور نجد کے حنبلیوں سے دوچار ہوئے اور صدر شہید کے طریقے سے الگ ہو گئے ت دونوں جماعتوں (حزبِ دہلوی اور حزبِ صادق پوری) کے علوم اور معارف میں بڑ اختلاف رونما ہو گیا)

ظاہر یہ، محدثین، حنابلہ نجد، گو تین لقب ہیں، مگر ان تینوں کے مصداق غالباً نجد کے حنبلی ہی ہیں، اس لئے ہم پہلے یمن کے زیدیوں سے شروع کرتے ہیں۔ اس تحریر کے پڑھنے والوں کو غالباً اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں، کہ

"بعض ائمۃ الصادق پورین" کا اشارہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کی طرف ہے، ان کا قصور یہ ہے کہ یہ سفرِ حج (۱۲۴۸-۹ھ) کے سلسلہ میں یمن ہوتے ہوئے قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) سے سند و اجازتِ حدیث لے آئے تھے، جسے مولانا عبید اللہ معاف کرنے کے لئے تیار نہیں، اس لئے کہ ہمارے مولانا کے نزدیک امام شوکانی قطعی طور پر زیدی ہیں، صاحبِ نیل الاوطار کے علم و فضل کا انھیں پورا اعتراف ہے، لیکن تقلید کی جکڑ بندیوں سے آزادی انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، بہرکیف شوکانی کے متعلق مولانا کی رائے سننے کے لائق ہے:-

"..... واشتغلت بالاستفادة من كتبه مدة طويلة وانى معترف بان الله اعاننى بتلك التصانيف على فهم طريقة المحققين لكن ما وافقت الشوكانى فى كثير من مجتهداته والذى اعتقد فى حقه انه عالم منصف مجتهد فى الاصول والفروع زيدى ينصر السنة لكن لا يوافق اهل السنة الفقهاء ولا اهل الظاهر منهم فى جميع ما يقررونه۔" (ص ۱۳۶)

(اور میں ان کی کتابوں سے ایک عرصہ تک استفادہ کرتا رہا، اور مجھے اس کا اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کے ذریعہ مجھے محققین کے طریقے کے سمجھنے کا سلیقہ عطا کیا، لیکن بہتیرے اجتہادی مسئلوں میں ان کی مخصوص رائے سے اتفاق نہ کر سکا اور ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ ایک انصاف پسند عالم، اصول و فروع میں مجتہدانہ نظر و فکر رکھنے والے زیدی ہیں اور سنت کے حامی، لیکن تمام باتوں میں نہ تو وہ اہلِ سنت فقیہوں کے ہم نوا ہیں نہ ظاہریوں کے)

زیدیت کے سوا، راقم کو اس "چارج شیٹ" کے حرف حرف سے اتفاق ہے۔ واقعی وہ محقق ہیں، اور اصول و فروع میں مجتہد بھی "القول المفید فی ادلة الاجتہاد والتقلید" اور "ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول" اس پر گواہ ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ فقہ میں فقہا اور ظاہریوں دونوں سے متعدد و مختلف مسائل میں الگ رائیں بھی رکھتے ہیں، "الدرر البهیة" اور اس کی شرح "الدراری المضیئة" اس کی آئینہ دار ہیں، پر اس کے باوجود، وہ زیدی نہیں، تحقیقی مسلک اور مجتہدانہ نظر و فکر سے زیدیت تو لازم نہیں آتی، اور یہ ایسی روشن حقیقت ہے جسے ہر طالب علم جانتا ہے، لیکن جب ایک جہاں دیدہ عالم انھیں زیدی کہتا ہے اور اس کی بنیاد پر قیاس و تخمین کے ہوائی قلعے بھی تیار کرتا ہے……

۱؎ مولانا پہلے شوکانی کو زیدی کہتے ہیں، اس کے بعد ان کے ایک شاگرد (عبد الحق بنارسیؒ) کو زیدی شیعہ کہتے ہیں، اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سید شہیدؒ کی غیبوبت کے مسئلے میں یہ شیعہ (عبد الحق بنارسیؒ) اور شوکانی کا ایک دوسرا شاگرد (ولایت علیؒ) پیش پیش تھے، گویا کہنا یہ چاہتے ہیں، گو صاف صاف نہیں کہتے، کہ سید صاحبؒ کی غیبوبت کا خیال شیعوں سے مستعار لیا گیا ہے، کہاں کی بات کہاں پہنچا دی، یہ ہوائی قلعے نہیں تو اور کیا ہیں؟

لیکن بدقسمتی سے اس کی پہلی اینٹ ہی غلط رکھی گئی، یعنی شوکانی پر زیدیت کا الزام، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے مان بھی لیا جائے (جیسا کہ ہم نے کہیں پچھلے صفحات میں بھی اشارہ کیا ہے) تو زیدیت سے غیبوبت کا عقیدہ کس طرح مستعار لیا گیا؟ زیدیہ اور اثنا عشریہ میں یہی تو فرق ہے، امام غائب کا عقیدہ اثنا عشریہ کا جزو ایمان ہے، زیدیوں کے

تو پھر جانی بوجھی ہوئی چیز کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ خاکسار کی یہ کوشش ہوگی کہ مختصر سے مختصر طور پر اپنی گذارشیں پیش کر دے:۔

(۱) مولانا کے انداز بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں زیدی ہی زیدی ہیں اور وہاں کسی متبع سنت عالم کا وجود وہ مستبعد خیال کرتے ہیں، لیکن یہ واقعہ اور حقیقت کے خلاف ہے، یمن میں محقق اہل سنت علماء کا گروہ ہمیشہ اور ہر دور میں رہا ہے، ان کی تصنیفیں "یمنی ایمان" اور "یمنی حکمت" کے نمونوں سے بھری پڑی ہیں۔

(الف) السید محمد بن ابراہیم بن عبد اللہ عز الدین المرتضیٰ ابن الہادی ابن الوزیر صاحب العواصم والقواصم فی الذب عن سنۃ ابی القاسم ﷺ (سنہ ۸۴۰ھ) ان محقق علمائے سنت کے سرخیل ہیں، علامہ ابن الوزیر کے "تسنن" میں تو شاید ہمارے مولانا کو بھی کلام نہ ہو، انھوں نے اپنی تصنیفات میں زیدیت سے صاف صاف

قائل نہیں، یہ زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم (متوفی سنہ ۱۲۲ھ) کے پیرو ہیں۔ زیدیت کے متعلق تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (۱) توضیح المسائل العقلیہ از عماد الدین یحیٰ بن محمد بن حسن بن مسعود المقرائی الزیدی (ف سنہ ۹۶۲ھ) ورق ۴، ۲۷، ۳۰ الخ (۲) الملل والنحل (شہرستانی) صفحہ ۱۱۵، ۱۲۱، لندن (۱۸۴۲ء) (۳) تحفہ اثنا عشریہ (شاہ عبدالعزیز صاحب) ص ۱۰، نیز دیگر مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے حوالے کے لئے ملاحظہ ہو: فہرست مشروح انگریزی (مشرقی) کتاب خانہ پٹنہ جلد ۱۵ نمبر ۱۳۲۶ اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مضمون "الزیدیۃ" (۴: صفحہ ۱۹۳۶ء)

برأت کی ہے، البتہ یہ دوسرے فقہی مذاہب کی تقلید سے بھی آزاد ہیں، جیسے شاید مولانا عبید اللہ سندھی نہ کریں، یہ موقع طول کا نہیں، تفصیلی حالات وافکار کے لیے ملاحظہ ہو: "المعجم" لابن فہد المکی[1] (ف ۸۸۵ھ)، ورق ۱۷۶، الف؛ مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ نمبر ۲۲۲۹؛ الضوء اللامع، جلد ۶، ص ۲۷۲؛ اتحاف النبلاء: ص ۴-۳-۳۷۳؛ بروکلمن، ۲: ۱۸۸؛ ذیل، ۲: ۲۴۹؛ نیز البدر الطالع: ۲: ۹۳-۸۱)

(ب) امام محمد بن اسمٰعیل الامیر الکحلانی الصنعانی (ف ۱۱۸۲ھ) صاحب "سبل السلام شرح بلوغ المرام"، زیدیت کی تردید میں ان کی ایک مستقل کتاب "جواب اہل السنۃ فی نقض کلام الشیعۃ والزیدیۃ" (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ نمبر ۱۱۸۵) موجود ہے، جسے پڑھ کر ان کے اتباع سنت کا جذبہ معلوم کیا جا سکتا ہے، اور یوں ان کے عقائد وافکار کا سرسری اندازہ لگانے کے لئے ان کے مختصر رسالے "تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد" کا مطالعہ کافی ہوگا، جس کا لہجہ تقویۃ الایمان سے بھی زیادہ سخت ہے، البتہ تقلید کے یہ بھی دشمن ہیں، اور

---

[1] ابن فہد (ف ۸۸۵ھ) کی معجم چونکہ قلمی اور کمیاب ہے اس لئے علامہ ابن الوزیر کے متعلق ان کا بیان نقل کر دینا بہتر ہوگا:

وینتمی الی مذاہب اہل الحدیث کعادۃ الحنابلۃ شدید المیل الی السنۃ ویتظاہر بمذہب اہل السنۃ بخلاف اہل بیتہ ویجتہد فی اقوال الائمۃ ویختار مایرجح عندہ دلیلہ ..... والف مولفات مفیدۃ تؤذن بکثرۃ فضلہ ..... واکثر من الرد علی الزیدیۃ الذین نقموا منہ اتباع مذہب اہل السنۃ (المعجم لابن فہد المکی، ورق ۱۷۶، الف)

سخت، حرم میں چار مصلوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"...... ما احدث فیہ (الحرم) بعض ملوك الشراكسة الجهلة الضلال هذه المقامات الاربعة التي فرّقت عبادات العباد واشتملت على ما لا يحصيه الا الله من الفساد ......
(تطهير الاعتقاد مطبع المنار ۱۳۴۳ھ)

...... یہ جو بعض جاہل گمراہ کن چرکسی فرمانرواؤں نے حرم میں عبادت کے لئے چار مقامات الگ الگ کر دیئے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفریق میں (جو گویا بندوں کی پرستش کے لئے ہوئی ہے) فتنہ و فساد کے کتنے جراثیم چھپے ہوئے ہیں۔

(۲) انہی دونوں بزرگوں کی طرح امام محمد بن علی شوکانی (المولود ۱۱۷۲ھ المتوفی ۱۲۵۰ھ) بھی محقق سلفی عالم ہیں، علامہ ابن الوزیر اور امام محمد بن اسمٰعیل الامیر کی طرح انھوں نے بھی زیدیت کی جا بجا تردید کی ہے، اصول و فروع زیدیہ کی تردید میں مستقل رسالے لکھے ہیں، ان کو زیدی کہنا حق و صداقت کا منہ چڑھانا ہے، شواہد ملاحظہ ہوں:۔

(الف) زیدی عقائد میں معتزلہ سے قریب ہیں، اور اپنے کو "اہل العدل والتوحید" کہتے ہیں:۔

"اکثر زیدیہ در فروع موافق مذہب حنفیہ اند و در اصول مطابق اعتقاد معتزلہ" (تحفہ اثنا عشریہ ص ۱۰ وغیرہ)

امام شوکانی عقائد میں ٹھیٹھ سلفی ہیں، ان کا مختصر رسالہ "التحف فی مذاہب السلف" اس پر سند ہے۔

(ب) زیدی فروع میں ایک خاص مسلک رکھتے ہیں اور حنفیہ سے قریب

ہیں، امام نے ان کے مخصوص مسائل کی تردید میں متعدد رسالے لکھے ہیں،

(۱) السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازھار میں زیدیہ کی سب سے زیادہ مقبول کتاب الازہار فی فقہ الائمۃ الاطہار کا کھرا کھوٹا الگ الگ کر دکھایا ہے، الازہار امام احمد بن یحییٰ ابن مرتضیٰ بن مفضل (ف ۸۴۰ھ) کی تصنیف ہے اور فقہ میں اہل یمن کا مرجع و ماوی ہے، علمائے یمن نے اس کی بیسیوں شرحیں لکھی ہیں۔ خود مصنف نے الغیث المدرار کے نام سے چار جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے، (تاریخ الیمن لعبد الواسع الیمنی: ص ۲۴۲، بروکلمن ۲،۱۸۷، ذیل = ۲، ۲۴۴-۵) اسی الازہار کی تنقید کی وجہ سے صنعاء میں شوکانی کے حامیوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان سخت ہنگامہ برپا ہوا:

"..... وثارت من اجل ذلک فتنۃ فی صنعاء الیمن بین من ھو مقلد وبین من ھو مقتد بالدلیل توھما من المقلدین انہ ما اراد الا ھدم مذھب اھل البیت لان الازھار ھو عمدتھم فی ھذہ الاعصار....."

(حسین بن محسن السبعی: نیل الاوطار ۱:۱۲)[1]

اور اسی وجہ سے صنعاء (یمن) میں مقلدوں اور دلیل وحجت پر عمل کرنے والوں کے درمیان بڑا ہنگامہ ہوا۔ مقلد یہ سمجھے کہ یہ (شوکانی) اہل بیت کا مذہب ختم کرنا چاہتے ہیں، چونکہ پچھلی صدیوں میں الازہار ہی پر ان کا تکیہ رہا ہے۔

" " "

---

[1] نیل الاوطار جلد اول (مطبوعہ مصر ۱۲۹۷ھ) کے آغاز میں (ص ۱۴-۹) حسین بن محسن السبعی الانصاری (ف ۱۳۲۶ھ) کے قلم سے مصنف نیل کا ترجمہ درج ہے، یہ ٹکڑا انہوں نے

نواب صدیق حسن خان صاحب نے بھی غالباً اسی فتنے کی طرف اشارہ کیا ہے:

"زیدیہ را بسبب رد بر مذہب ایشاں تعصبے تمام با او بود، بارہا بصورت بلوی بر آمدہ خانۂ اورا محاصرہ کردند، چوں وے یکبار از خانہ بر آمد ہمہ بگریختند" الخ (اتحاف النبلاء ص ۴۰۹)

(ا) الصوارم الهندية المسلولة على الرياض الندية:

زیدیہ وضوء سے پہلے غسل فرجین کے قائل ہیں، اور یہ ان کے نزدیک وضوء ارکان میں داخل ہے، اسی کی تردید میں یہ رسالہ ہے۔

(ب) تشنيف السمع بابطال ادلة الجمع، زیدیہ حضر میں بھی جمع صلاتین جواز کے قائل ہیں، قاضی شوکانی نے تشنیف السمع میں اس کی تردید کی ہے۔ زیدیہ تردید میں ان کے اور بھی رسالے ہیں جن کا استقصار یہاں مشکل ہے۔

(ج) الدر النضید فی اخلاص کلمة التوحید، امام شوکانی کا ایک چھوٹا سا بڑی رسالہ ہے جس کے مضامین تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید سے ملتے جلتے ہیں، تشدد کا بھی وہی انداز ہے، جزئی اختلافات کا تذکرہ آگے آئے گا، شیخ الاسلام بن عبد الوہابؒ (ف ۱۲۰۶ھ) کی طرح انہوں نے بھی اس رسالے میں قصیدۂ بردہ اس شعر پر اعتراض کیا ہے:-

یا اکرم الخلق مالی من الوذ به   سواك عند حلول الحادث الجسم

(صفحہ کا بقیہ)
حسن بن احمد البہکلی تلمیذ شوکانی کی کتاب (نفخ العود فی ایام الشریف حمود) سے نقل کیا ہے۔
توحید ص ۷۰ مطبوعہ باہتمام شرف الدین واولادہ الدار النضید ص ۲۹ مصر ۱۳۴۳ھ

اے مخلوقات میں سب سے زیادہ بزرگ مصیبتوں کے عالم میں آپ کے سوا میرا کون ہے؟ جس کے دامن کی پناہ لے سکوں

(د) شوکانی حدیث کے باب میں خالص اہل سنت کا مسلک رکھتے ہیں اور صحیحین کو وہی درجہ دیتے ہیں جس کی یہ مستحق ہیں۔ تحفۃ الذاکرین[1] کے تمہیدی مقدمے میں لکھتے ہیں:-

"......واعلم ان من کان من احادیث هذا الکتاب فی الصحیحین فقد سفر صبح الصحة لکل ذی عینین لانه قد قطع فیما عرق النزاع ما صح من الاجماع علی تلقی جمیع الطوائف الاسلامیة لما فیهما بالقبول وهذه رتبة فوق رتبة التصحیح عند جمیع اهل المعقول والمنقول (ص ۴)

واضح رہے کہ اس کتاب کی جو حدیثیں صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) میں ہیں تو ان کی صحت روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکی ہے اس لئے کہ ان کی قبولیت پر تمام اسلامی جماعتوں کا اجماع ہو چکا ہے جس نے ان کے باب میں کسی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں باقی رکھی ہے اور تمام اہل معقول و منقول کے نزدیک یہ تصحیح کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔

اب ہمیں بتایا جائے کہ کوئی زیدی صحیحین[2] کو غیر مشروط طور پر قبول کر سکتا ہے؟ نرم سے نرم زیدی بھی حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی افضلیت اور استحقاق خلافت سے دست بردار نہیں ہو سکتا، اور صحیحین کے تسلیم کرنے سے اس عقیدے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔

---

[1] شمس الدین ابو الخیر ابن الجزری الدمشقی (ف ۸۳۳ھ) کی حصن حصین کی شرح شوکانی نے تحفۃ الذاکرین

[2] مثال کے طور پر صحیح بخاری میں باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد کے ابواب (ج ۲ ص ۱۹۹ اور اس کے بعد، مطبع شرقیہ مصر ۱۳۰۴ھ) سے کوئی زیدی (کتنا ہی روادار کیوں نہ ہو) اتفاق نہیں کر سکتا.

یہاں تک امام شوکانی کی زیدیت پر گفتگو تھی، لیکن مولانا کو اس سلسلہ میں یمن کے اس نامور عالم سے ایک اہم شکایت ہے، اچھا ہو کہ آپ انہی کی زبان سے سنئے:-

"یمنی تحریک کے ایک بزرگ امام شوکانی محقق محدث ہیں، اور حزب ولی اللہ کے اتباع میں سے بعض فرقے مستقل طور پر ان کی اتباع کا دم بھرتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ اتباع سنت کی تفصیلی دعوت میں امام شوکانی حزب ولی اللہ کا مساہم ہے اگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ شوکانی زیدی ہیں، اس لئے حنفیہ سے گو بعض مسائل میں اشتراک ضروری ہے پھر بھی وہ حجیت اجماع پر صاف رائے نہیں رکھتے۔ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول اور مولانا شہیدؒ کا رسالہ اصول فقہ ملا کر پڑھیے تو فرق واضح ہو جائے گا۔"[1]

اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ شوکانی حجیت اجماع پر صاف رائے نہیں رکھتے لیکن مولانا اگر اس اعتراض کو یوں ادا کرتے کہ اجماع کے مسئلے میں شوکانی حنفیہ کے ہم خیال نہیں، تو زیادہ صحیح ہوتا، اور یہ کوئی وجہ شکایت نہیں تعجب اب انھیں "مجتہد فی الاصول والفروع" مان چکے، تو پھر آپ انھیں اپنے خاص مسلک کا

---

(۱) مولانا نے دونوں کتابوں سے اقتباسات دے کر اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ہمیں رسالہ اصول فقہ اور ارشاد الفحول کے نقطہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے انکار نہیں، لیکن مولانا نے ارشاد الفحول کا صرف وہ ٹکڑا نقل کیا ہے جہاں شوکانی نے عام اجماع کی حجیت سے انکار کیا ہے... (الفرقان ...)

پابند کیوں دیکھنا چاہتے ہیں ؟ اجماع کے باب میں یہ کوئی نیا اختلاف نہیں، اجماع کی تعریف (حد و رسم)، ارکان، شرائط، کس میں سخت سے سخت اختلافات نہیں ؟ حنابلہ اور اہل ظاہر صرف اجماع صحابہ کو مانتے ہیں، خود امام احمد بن حنبل (ف ۲۴۱ھ) سے دو روایتیں ہیں، مشہور روایت تو یہی اجماع صحابہ کی صحت اور حجیت کی ہے، جس پر حنابلہ کا عمل درآمد ہے، دوسری روایت کے مطابق وہ اجماع کا وجود ہی نہیں تسلیم کرتے، (من ادعی الاجماع فهو كاذب) امام شوکانی کا رجحان بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق اجماع (یعنی الاجماع العام فی کل عصر) کی حجیت ان کے نزدیک مسلم نہیں، اور جہاں جہاں انھوں نے حجیت اجماع پر اعتراض کئے ہیں، وہاں یہی (اجماع عام فی کل عصر) مراد ہے۔ باقی رہا اجماع صحابہ، تو اس کے وہ منکر نہیں۔

(البحث السابع) اجماع الصحابة حجة بلا خلاف ونقل القاضي عبد الوهاب عن قوم من المبتدعة ان اجماعهم ليس بحجة وقد ذهب الى اختصاص حجية الاجماع باجماع الصحابة داؤد الظاهري وهو ظاهر كلام ابن حبان في صحيحه وهذا هو المشهور عن الامام احمد بن حنبل ...... وقال ابو حنيفة اذا

(ساتویں بحث) صحابہ کا اجماع بالاتفاق حجت ہے، قاضی عبد الوہاب نے مبتدعین کی ایک جماعت کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ان کے نزدیک اجماع صحابہ حجت نہیں اور داؤد ظاہری اجماع کی حجیت کو اجماع صحابہ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں، اور ابن حبان نے صحیح میں جو کچھ لکھا ہے، ظاہر اس کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں، "جب صحابہ کا کسی مسئلے پر

اجمعت الصحابۃ علی الشئ سلمنا | اجماع ہوگا، ہم اسے تسلیم کریں گے،
واذا اجمع التابعون زاحمناھم | اور تابعین کے اجماع میں ہم کلام
(ارشاد الفحول، ص ۷۰) | کریں گے۔

اس اقتباس سے امام شوکانی کا رجحان نمایاں ہے[۱]، پھر بھی ہمارے مولانا انھیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، اب تک تو حجیت اجماع پر ان کی رائے صاف نہیں تھی، لیکن آگے چل کر وہ انھیں خود بخود حجیت اجماع کا منکر قرار دے کر "شیعیت" (زیدیت نہیں) کی تعریض سے بھی دریغ نہیں کرتے:۔

"حجیت اجماع پر مدار ہے صدیق اکبر کی خلافت کا، مصحف عثمانی کے متبوع ہونے کا۔ ہم جدید اصطلاح میں اجماع کے عوض جمعیۃ مرکزیہ کا فیصلہ استعمال کرتے ہیں، آج جس چیز کو جمعیۃ مرکزیہ کا فیصلہ کہا جاتا ہے، وہی اس زمانہ کا اجماع ہے، اس کی حجیت کے بغیر کبھی کوئی سیاسی تحریک دنیا میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا شیعہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے، مگر اہل سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے۔ ...."

اہل انصاف غور کریں کہ یہ "شیعیت" کی تعریض کہاں تک حق بجانب ہے؟ رہا یہ کہ جمعیۃ مرکزیہ کا فیصلہ کہاں تک اجماع کا منشا پورا کرتا ہے؟

---

[۱] پوری مفصل بحث کے لیے ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول (ص ۷۰-۸۶ مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصریہ ۱۳۲۷ھ) کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سر دست ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے!

ہمارے مولانا نے نجدی اور یمنی تحریکوں کا بار بار نام لیا ہے 'یمنی تحریک سے ان کی مراد غالباً امام شوکانی کا مخصوص مسلک ہے، جس کے متعلق مختصر طور پر عرض کیا جا چکا، ورنہ ہمیں کسی یمنی تحریک کا حال معلوم نہیں جس سے حضرت سید شہید کے ماننے والے متاثر ہوئے ہوں، اور اسے "تحریک" کہا جا سکے، اور سچ پوچھئے تو مولانا عبید اللہ کی زیر نظر کتاب سے پہلے اس مخصوص انداز میں یمنی تحریک کا نام بھی نہیں سنا گیا تھا،

البتہ نجدی تحریک مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر بہت مشہور اور بدنام بھی ہے، بد قسمتی سے سید صاحبؒ کی دعوت تجدید و جہاد کی طرح یہ تحریک (اگر اسے تحریک کہنا صحیح ہو) بھی غیر تو غیر اپنوں میں بھی نہیں سمجھی گئی، اور "خوش عقیدہ" لوگوں میں اب تک موحدین نجد کے متعلق ایسے خیالات پائے جاتے ہیں کہ پڑھ کر اور سن کر حیرت ہوتی ہے، افسوس کہ یہ موقع اس تحریک پر بحث و نظر کا نہیں، اور راقم اس موضوع پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ لکھ بھی چکا ہے، (ملاحظہ ہو: سیرت محمد بن عبدالوہاب کا پہلا باب، معارف: بابت مئی و جون ۱۹۴۱ء) اس لئے یہاں مختصر سے مختصر لفظوں میں اپنا مدعا پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

نجدی تحریک، یا شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی دعوت توحید کا محور صرف دو مقدس چیزیں ہیں، جنھیں ہم کتاب و سنت کے نام سے یاد کرتے ہیں، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ

۱۱۱۱ھ بر ۱۲۷۶ھ کے معاصر ہیں اور دونوں بزرگوں نے دو چار سال آگے
پیچھے مسجد نبوی میں تعلیم حاصل کی ہے، دونوں وقت کے ناگفتہ بہ حالات سے متاثر
ہوئے (ملاحظہ ہو: الفرقان ولی اللہ نمبر طبع اول: ۴۰-۳۹) اور ملتی جلتی راہ
اختیار کی، یعنی دونوں نے دین مبین کو بدعتوں اور توہمات کی آلائشوں سے
پاک کرنے کی کوشش کی، کتاب و سنت کے چشمۂ صافی کی طرف دعوت دینے میں
دونوں شریک و سہیم ہیں، تقلید جامد کے بندھنوں کے توڑنے میں دونوں
ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصول
ہندستان اور نجد کی تحریکیں ایک ہیں، اور اسی یکسانی کی بنا پر اپنوں اور غیروں
دونوں کو غلط فہمیاں ہوئیں، اور سید صاحبؒ کی تحریک تجدید و جہاد کا ڈانڈا نجد
کی دعوت توحید سے ملا دیا گیا، یہ تصنیف یہاں تک بڑھی کہ حج کے موقع پر سید صاحب
کا نجدی داعیوں سے ملنے اور متاثر ہونے کا افسانہ زبان زد ہو گیا، حالانکہ یہ

حضرت سید شہیدؒ کی دعوت تجدید و جہاد کو نجد کی دعوت توحید کا شاخسانہ بتانے میں تقریباً تمام
ہی اہل قلم ہم زبان ہیں، اور بہت سے مستشرقوں نے ان کے سُر میں سُر ملانے کی کوشش کی ہے لیکن
اس سلسلے میں جو دلچسپ حماقتیں جناب مارگولیتھ علیہ ما علیہ سے سرزد ہوئی ہیں، وہ شاید کسی کے حصہ میں
نہ آئیں (ملاحظہ ہو: مقالہ وہابیت = انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ۴، ص ۱۰۹۰-۱۰۸۶)
یہ مضمون جہالت اور تنگ نظری کا مرقع ہے، وقت اور موقع تو نہیں کہ اس مقالے کی دلچسپیاں
بیان کی جائیں، اگر ایک لطیفہ نقل کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

"سید احمد کے بھتیجے یا بھانجے (nephew) محمد اسماعیل کی ایک کتاب الصراط المستقیم
ہندستان کے وہابیوں کا قرآن بتائی جاتی ہے۔"

(بقیہ ص ۱۰۴ پر)

سب مغربی مؤرخوں کی اپج کے سوا اور کچھ نہیں، نجد و ہند کی تجدیدی تحریکیں اپنی
اپنی جگہ بڑھیں اور پھلیں پھولیں، ہندستان کی دعوت توحید یعنی سید شہیدؒ اور
مولانا شہیدؒ کی دعوت شیخ الاسلام کی دعوت سے بالکل متاثر نہیں (تفصیل کے
کے لیے ملاحظہ ہو: الحرکۃ الوهابیۃ الهندیۃ السیاسیۃ، الضیاء جلد ۴،
وہابیت = ایک دینی و سیاسی تحریک، الہلال پٹنہ، اپریل، مئی، جون ۳۷ء
سید احمد شہیدؒ صـ ۲۲۴، ۲۴۳) لیکن اس اصولی اتحاد اور ظاہری مماثلت کے باوجود
دونوں تحریکوں میں کچھ اختلاف بھی ہے، اور یہ مقامی حالات اور مزاج کے تنوع
کے لحاظ سے ہونا ناگزیر تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے انہی اختلافات پر بہت
زور دیا ہے، اور حق یہ ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں
اس گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا کا ارشاد پورا کا پورا
نقل کر دیا جائے:۔

" البتہ عرب کی نجدی تحریک سے حزب ولی اللہ بعض امور میں اشتراک

(صـ ۱۰۳ کا بقیہ)

A work by Mohammad Ismail nephew of Saiyid Ahmad at Sirat al-Mustakim, is said to be The Kuran of The Wahabis of India (صـ ۱۰۹)

مولانا شہیدؒ سید صاحبؒ کے بھتیجے! صراط مستقیم وہابیوں کا قرآن! کیا کہنے ہیں اس تحقیق اور ریسرچ کے! کوئی نئی بات نہیں پیدا کی تو پھر ریسرچ کیا!!

رکھتا ہے، اس لئے ظاہر میں دونوں کو یکساں مان سکتے ہیں، عرب میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کے اتباع میں سے شیخ محمد عبدالوہاب[1] توحید کی دعوت دینے کے لئے اٹھتے ہیں، حزب ولی اللہ

---

[1] یہاں پر اصل کتاب کے حاشیے میں جناب شارح مولوی نورالحق صاحب علوی نے نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) کی کتاب ابجد العلوم سے شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب کا کچھ حال نقل کیا ہے، جس میں ہجو و مذمت کے سوا کچھ نہیں، نواب صاحب (اللہ انھیں معاف کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے) کا حال اس باب میں قابل رحم ہے، اہل نجد کے متعلق ان کے بیانات میں اتنا تعارض ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، ابجد العلوم، التاج المکلل، موائد العوائد میں طرح طرح کی بے اصل باتیں لکھ دی ہیں، وہ اپنی زندگی کی الجھنوں کے باعث اپنے کو نجدی، صادق، بلکہ محمد ابی کہلانے والی جماعت سے الگ دکھانا چاہتے تھے، ترجمان وہابیہ ان کے خیالات پریشان کا آئینہ ہے، لیکن جناب شارح کی خدمت میں ہمیں ایک بات عرض کرنا تھی کہ جہاں آپ نے ابجد العلوم سے نواب کی رائے نقل کی تھی، جس میں ابن عابدین شامی کی خرافات بھی ہیں، جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا جرم عبدالوہاب نام رکھنا ہے، یا محمد بن عبدالوہاب، وہیں نواب صاحب کا یہ قول بھی نقل کر دیا ہوتا جس میں انھوں نے شامی کا قول نقل کر کے اس کی تردید بھی کی ہے:-

"و ایں جا تصرف نظر بر ابن عابدین ظاہر شد در بیانکہ وے غیر خود را مشرک می داشت و اسلام را منحصر در طریقہ خود می پنداشت و ایں نیز معلوم شد کہ عقیدۂ او ہمہ موافق اہل سنت و جماعت است، ہر چہ نسبت وے می گویند مختلق و موضوع است و وے بدان راضی نیست و ایں فتراء و کذب ہم در حیات وے بر وے بستند و وے ازاں تبرا کردہ و بر آں انکار نمود الخ...." (ابجد العلوم ص ۱۲۸)

میں بھی توحید کی دعوت اسی طرح موجود ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا احترام بھی دونوں تحریکوں میں مسلم ہے۔

امام ولی اللہ نے شیخ ابراہیم کردی مدنی کے کتب خانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے کافی استفادہ کیا ہے، ازالۃ الخفاء میں بعض اساسی مسائل ایسے ہیں جو یقیناً منہاج السنۃ سے لئے گئے ہیں، امام ولی اللہ، شیخ ابراہیم کی اتباع میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی یکساں عزت اور عظمت مانتے ہیں ....

ایسا ہی مولانا محمد اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان (جو حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے) شیخ محمد عبدالوہاب (محمد بن عبدالوہاب) کی کتاب التوحید کی طرح بعض مقامات پر ایک ہی سی بات لکھی ہے؛ ہندستان میں جس قدر اہل علم حزب ولی اللہ کے مخالف ہیں، وہ ان اشتراکی مواقع کی بنا پر دونوں تحریکوں کو ایک بنانے کے لئے کافی سے زیادہ کوشش کر چکے ہیں، ایسا ہی مولانا شہید کی تقویۃ الایمان کا التوسل فی الدعا کو جائز قرار دینا، اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہ مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دینا، دو اساسی مسئلے ہیں جو کتاب التوحید کے مناقض ہیں، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے اتباع ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، جو مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے ان دونوں مسئلوں میں تابع ہوں، ایسی حالت میں دونوں تحریکوں کا ایک سمجھنا سرسری سمجھ کا مغالطہ ہے؛ (ص ۱۳۶-۱۲۹)

جیسا کہ راقم پہلے عرض کر چکا ہے، مولانا سندھی کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ نجد و ہند کی تحریکیں ایک نہیں، لیکن چند فروعی اختلافات کی بنا پر ہم دونوں کو ایک دوسرے کا مناقض بھی نہیں سمجھتے، جب توحید کی دعوت دونوں تحریکوں میں موجود ہے، اور کتاب و سنت کی پیروی پر دونوں کا اصرار ہے، تو پھر فروعی اختلافات کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے؟ ہمارے نزدیک امام محمد بن اسمٰعیل الامیر صنعانی (۱۰۹۹ھ - ۱۱۸۲ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) اور شیخ محمد ابن عبد الوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) تینوں بارہویں صدی ہجری میں اسوہ محمدی کے سچے نمونے تھے، اور اس وقت کی تیرہ و تاریک فضا میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ چاہیں تو انہیں مجدد بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے ماحول میں دین کی تجدید کی، سنت محمدی کے صاف اور شفاف چشمے کو شرک و بدعت کی آلائشوں سے پاک کیا اور یہ انہی نفوس قدسیہ کے دم قدم کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کتاب و سنت کا نام لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور اس پر عمل کرنا اپنا شعار بتلاتے ہیں۔

انہی بزرگوں کی صف میں ان کے خوشہ چین قاضی محمد بن علی شوکانی (۱۱۷۳ھ - ۱۲۵۰ھ) حضرت سید احمد بریلوی (۱۲۰۱ھ - ۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی (۱۱۹۳ھ - ۱۲۴۶ھ) بھی شمار کیے جا سکتے ہیں، ان تمام مصلحین امت کی جدوجہد کا مرکز ایک تھا، سب کے سب شمع رسالت کے پروانے تھے، اور کتاب و سنت کے شیدائی، یہ اور بات ہے کہ کہیں امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کا رنگ غالب تھا، کہیں ہندستانی تصوف کے اثرات

باقی رہ گئے تھے، اور کہیں طریقہ محمدیہ کی تلقین ہو رہی تھی، کسی پر شوق شہادت کا غلبہ تھا، کوئی تقلید جامد کے حق میں شمشیر براں کی حیثیت رکھتا تھا، اور کسی کی معتدل مزاجی فقہ سے لے کر تصوف تک تطبیق کو پسند کرتی تھی، پر یہ رجحانات کا فرق ہے، اصولی اختلاف نہیں، اور مزاج و مشرب کے اتنے معمولی فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا مناقض نہیں کہا جا سکتا، اور ایک تحریک (یا دعوت) کے عقیدت مند کے لئے دوسرے کے ساتھ وابستگی حرام نہیں قرار دی جا سکتی، ایک ولی اللہی شوکانی اور ان کے شاگردوں سے استفادہ کر سکتا ہے، اور نجدی، ولی اللہیوں کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر سکتا ہے، اور یمنی لیلائے علم کی تلاش میں بادیہ نجد کی ٹھوکریں کھانا گوارا[1] کر سکتا

---

[1] یہ کوئی خیالی باتیں نہیں، پچھلے تذکروں میں اس "لین دین" کی بے شمار مثالیں ملیں گی، دو تین نظریں سرسری طور پر عرض ہیں، عبدالحق بنارسی (ف سنہ ۱۲۸۶ھ) نے شوکانی (ف سنہ ۱۲۵۰ھ) اور دوسرے علمائے حجاز و یمن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، محمد بن ناصر حازمی نجدی (ف سنہ ۱۲۸۳ھ) نے شوکانی سے یمن میں اور شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی (ف سنہ ۱۲۶۲ھ) سے حجاز میں تحصیل کی، اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف سنہ ۱۲۰۶ھ) کے پرپوتے اسحاق بن عبدالرحمن بن حسن بن محمد نجدی حنبلی (ف سنہ ؟) نے سید نذیر حسین صاحب محدث سورج گڈھی دہلوی (سنہ ۱۳۲۰ھ) اور مولانا محمد بشیر سہسوانی (ف سنہ ۱۳۲۶ھ) سے ہندستان آکر استفادہ کیا...... الخ

اور علم وعمل کے اس "لین دین" میں فائدے کے سوا نقصان کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ہندی نژاد کے لیے یمنی یا نجدی اہل علم کی شاگردی اس قدر ملعون ومذموم کیوں قرار دی جا رہی ہے؟ کیا اسلام اسی تنگ نظری اور جغرافی حد بندی کی تعلیم دیتا ہے؟

رہ گئے چند اختلافی مسئلے، تو سمجھ دار لوگوں کے لیے ترجیح کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ آخر کتاب "التوحید" اور "تقویۃ الایمان" آسمانی کتابیں تو ہیں نہیں جن سے ادنیٰ اختلاف بھی معصیت شمار ہو، اور پھر یہ مختلف فیہ مسئلے ہیں کتنے؟ مولانا عبیداللہ سندھی جیسے نکتہ رس عالم نے بڑی کوشش سے ایسے دو اساسی مسئلے نکالے ہیں، جن میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے پہلا مسئلہ تو "التوسل فی الدعاء" کا ہے:۔

"التوسل فی الدعاء، مثلاً خدائے تعالیٰ سے استدعاء کی جائے، بحرمت فلان یا بحق فلان کہہ کر، تو اس توسل کو ابن عبدالوہاب بہایت شدت سے ممنوع قرار دیتا ہے، مولانا محمد اسمٰعیل کے ہاں یہ توسل ناجائز نہیں ہے "تقویۃ الایمان" میں اس کے جواز کی تصریح کرتے ہیں"۔

(ص ۳۶ احاشیہ)

تقویۃ الایمان کی تصریح بھی پیش خدمت ہے:۔

"اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو لوگوں میں ایک ختم مشہور ہے کہ اس میں یوں پڑھتے ہیں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" یعنی اے شیخ عبدالقادر جیلانی کچھ دو تم اللہ کے واسطے یہ لفظ نہ کہا جائے۔

ہاں، اگر یوں کہے کہ یا اللہ مجھے شیخ عبد القادر کے واسطے، تو بجا ہے..........." (ص ۵۶، مطبوعہ نول کشور ۱۳۰۸ء)

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ قابل لحاظ ہے کہ توسل فی الدعا ایسا اساسی مسئلہ نہیں جس میں مولانا شہیدؒ اور شیخ ابن عبد الوہابؒ کے اختلاف کو اتنی اہمیت دی جائے، دوسری بات یہ کہ مولانا سندھی کا بیان بہت مجمل ہے، اختلاف کی نوعیت واضح کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، توسل فی الدعا کی یہ نوعیت جسے ہم توسل بالذوات بھی کہہ سکتے ہیں، احیاء میں بلا اختلاف جائز ہے[1]، اموات سے توسل کے یہ معنی کہ ان کے اعمال خیر ومقبولہ سے توسل کیا جائے، تو جس طرح اپنے اعمال خیر سے توسل جائز ہے، اسی طرح دوسرے احیاء واموات کے اعمال خیر سے بھی، البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلاً ان سے مانگا جائے، تو یہ شرک ہے، اور اس کے عدم جواز پر بھی اتفاق ہے اور اگر ذوات صالحہ (اموات) سے یہ سمجھ کر توسل کیا جائے، کہ شاید ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دعاء قبول فرمائے، تو یہ صدیوں سے محققین علماء کے درمیان مختلف

---

[1] واما التوسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم والتوجہ بہ فی کلام الصحابۃ والتابعین فیریدون بہ التوسل بدعائہ وشفاعتہ.... والثانی التوسل بدعائہ وشفاعتہ وھذا کان فی حیاتہ ویکون یوم القیامۃ یتوسلون بشفاعتہ (التوسل والوسیلۃ لابن تیمیۃ ص ۴۴) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام تیمیہؒ کے نزدیک توسل کے معنی توسل بالدعا ہی کے ہیں جو احیاء میں جائز ہے۔

مسئلہ رہا ہے (اور توسل فی الدعاء کی یہی وہ صورت ہے جس میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی رائیں مختلف ہیں)، شیخ عزالدین ابن عبدالسلام (ف ۶۶۰ھ) توسل بالذات (اموات کی صورت میں) کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص کرتے ہیں،

لا یجوز التوسل الی اللہ تعالیٰ الا بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان صح الحدیث فیہ (الدر النضید: ص ۶)

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی سے توسل کرنا جائز نہیں بشرطیکہ وہ حدیث جو اس پر دلالت کرتی ہے صحیح مان لی جائے۔

اس کے برخلاف امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اسے بالکل ممنوع قرار دیتے ہیں، اور یہی مسلک فقہائے حنفیہ[لہ] کا معلوم ہوتا ہے، شیخ محمد بن عبدالوہاب بھی امام ابن تیمیہؒ کے مسلک پر سختی کے ساتھ عامل ہیں، امام شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) تمام انبیاء اور صالحین سے توسل کو جائز کہتے ہیں، (الدر النضید ص ۶-۸) تقویۃ الایمان کی عبارت سے مولانا شہیدؒ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے،

لہ ویکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلان او بحق انبیائک ورسلک لانہ لاحق للمخلوق علی الخالق (الہدایۃ: کتاب الکراھیۃ: ص ۱۰۸۶، مطبوعہ کلکتہ: ۱۲۳۴ھ)

اور یہ مکروہ ہے کہ کوئی بحق فلاں کہہ کر دعا مانگے یا اللہ تعالیٰ سے اس کے پیغمبروں اور رسولوں کی حرمت اور حق کا واسطہ دلا کر استدعا کرے اس لئے کہ خالق پر مخلوق کا کوئی حق نہیں ہو سکتا،

نیز ملاحظہ ہو جلاء العینین ص ۲۸۱ -

جب محققین علمائے سنت توسل بالذوات کے مسئلے میں اتنی مختلف رائیں رکھتے ہیں[1] تو پھر کسی ایک رائے پر اتنا تشدد کیوں برتا جائے؟ اور اگر مولانا شہیدؒ کے کسی عقیدت مند کو فقہائے حنفیہ اور امام ابن تیمیہؒ کی رائے بھلی لگتی ہو، تو صرف اتنی سی بات پر اسے مولانا شہیدؒ کے حلقہ ارادت سے کیوں خارج کیا جائے؟

دوسرا اختلافی مسئلہ شرک اصغر اور شرک اکبر کا ہے:-

"دوسرا مسئلہ حسب ذیل ہے، آیہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ کی تفسیر میں ہر دو کا اختلاف ہے، اس آیت کا ظاہری اقتضاء یہی ہے کہ شرک غیر مغفور ہے اور ماورائے شرک دوسرے کبائر قابل مغفرت ہیں، یہ اس آیت کا ظاہری تقاضا ہے اب شرک کا لفظ دو درجوں پر اطلاق ہوتا ہے، شرک اکبر، شرک اصغر، شرک اکبر تو یقیناً کفر ہے..... شرک اصغر کو اہل علم کبائر میں شمار کرتے ہیں، ابن عبدالوہاب اس کو شرک اکبر سے ملاتا ہے، چونکہ نص میں عموم ہے، اس لئے وہ تخصیص کی اجازت نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان شرک اصغر میں مبتلا ہے، اس کا اسلام ان کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

مولانا شہید یہاں حکم کے طور پر ایک فیصلہ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں، شرک اصغر کی بھی جس قدر سزا مقرر ہے، وہ مغفور نہیں ہوگی، شرک اصغر

---

[1] توسل پر تفصیلی معلومات کے لئے سب سے بہتر کتاب امام ابن تیمیہؒ کی قاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ ہے جلاء العینین، ص ۳۱۵-۲۶۹ میں بھی مفصل بحث ہے، اور فریقین کے دلائل جمع کر دیئے گئے ہیں۔

کبائر میں شامل نہیں، اس کی سزا اس کے مرتکب کو ضروری طور پر بھگتنا پڑے گی، مگر وہ کفر کے برابر نہیں ..... (ص ۱۳۷-۱۳۶ حاشیہ)

ہمیں افسوس ہے کہ یہاں مولانا سندھی نے ابن عبدالوہاب اور مولانا شہید دونوں میں سے کسی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کی، تقویۃ الایمان کا ٹکڑا جس پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے حسب ذیل ہے:-

"اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک نہ بخشا جاوے گا، جو اس کی سزا ہے مقرر ملے گی، پھر اگر پہلے درجے کا شرک ہے کہ آدمی جس سے کافر ہو جاتا ہے، تو اس کی سزا یہی ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو دوزخ میں رہے گا ..... اور جو اس سے ورے درجے کا شرک ہے، ان کی سزا جو اللہ کے یہاں مقرر ہے، سو پاوے گا، اور باقی جو گناہ ہیں ان کی جو کچھ سزائیں اللہ کے یہاں مقرر ہیں، سو اللہ کی مرضی پر ہیں چاہے دیوے چاہے معاف کرے۔ (تقویۃ الایمان: ص ۱۳)

جہاں تک شرک کے غیر مغفور ہونے کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ مندرجہ بالا عبارت سے شرک اصغر پر اصرار کرنے والوں کے مسئلے میں اختلاف رائے کا شبہ ہوتا ہے، لیکن تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے مطالعے اور مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک اصغر میں بھی دونوں کی رائیں ملتی جلتی ہیں، اہل نجد نے بھی ان مسلمانوں کی، جو شرک اصغر میں مبتلا ہیں، علی الاطلاق تکفیر نہیں کی۔[۱] البتہ تارکین صلوٰۃ اور مانعین زکوٰۃ کی طرح یہ ان لوگوں

---

[۱] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے بھی قتال کے قائل ہیں، جو قبر پرستی اور تعزیہ پرستی وغیرہ (جیسے شرک اصغر کہا جاتا ہے) میں مبتلا ہیں اور وہ بھی تبلیغ و فہمایش کے بعد، بالکل اسی طرح مولانا شہید بھی قبر پرستوں کو (یعنی ان مسلمانوں کو جو شرک اصغر میں مبتلا ہیں) مشرکین عرب سے کم نہیں سمجھتے :-

"یعنی شرک دو طرح ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ کسی کے نام کی صورت (مورت) بنا کر پوجے، اس کو عربی زبان میں صنم کہتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ کسی تھان کو مانے یعنی کسی کے مکان یا درخت کو...... کسی کے نام کا ٹھہرا کر پوجے، اس کو زبان عربی میں وثن کہتے ہیں، اس میں داخل ہے، قبر اور کسی کا چلہ اور لحد اور کسی کے نام کی چھڑی اور تعزیہ اور علم...... کہ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں، اور وہاں جا کر نذریں چڑھاتے، اور منتیں مانتے ہیں...... اور اسی طرح بعض مکان بزرگوں کے نام سے مشہور کرتے ہیں...... غرض کہ یہ سب وثن ہیں،

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ)

لہ ومن جملۃ ھذہ الاکاذیب ما ذکرہ ...... ان شیخ الاسلام محمد بن عبد الوھاب یسفک الدماء...... ویتجاری علی قتل النفوس...... وتکفیر الامۃ المحمدیۃ فی جمیع الاقطار وھذا کلہ کذب (تنزیہ محمد بن عبد الوہاب ص ۳۵)

اور ان کذب بیانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب (خلق اللہ کا) خون بہاتے ہیں اور انسانوں کی جان لینے میں حد سے زیادہ جری ہیں اور دنیا جہان کے مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں،...... یہ سب جھوٹ ہے۔

تہ تارکین صلوٰۃ کے بارے میں اہل نجد کے مسلک سے واقفیت کے لئے ملاحظہ ہو: الہدیۃ السنیۃ (ص ۱۲۶)

سو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ مسلمان جو قیامت کے نزدیک مشرک ہو جاویں گے ان کا شرک اسی قسم کا ہوگا، کہ ایسی چیزوں کو مانیں گے، برخلاف اور مشرکوں کے جیسے ہندو یا مشرکین عرب کہ اکثر صنم پرست ہیں یعنی مورتوں کو مانتے ہیں، سو دونوں مشرک ہیں، اللہ سے پھرے ہوئے رسول کے دشمن (ص ۴۳-۴۴، تقویۃ الایمان)

یہ مفہوم ایک دوسری جگہ اور صاف طور سے ادا ہوا ہے:-

"اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے، بلکہ اسی کا مخلوق اور بندہ سمجھتے تھے، اور ان کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے، مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی، اور نذر و نیاز کرنی، اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی ان کا کفر و شرک تھا، سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو کہ اس کو اللہ کا بندہ و مخلوق ہی سمجھے، سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہے۔ (ص ۸")

ہمیں بتایا جائے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ، ان کے شاگردوں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴) ان کا بڑا استدلال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس مستحکم مسلک سے ہے جو انھوں نے مانعین زکوٰۃ کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "تبرئۃ الشیخین الامامین من تزویر اهل الکذب والمین" مرتبہ سلیمان بن سحمان نجدی)

اور ماننے والوں نے اس سے زیادہ کیا کہا ہے؟ اور کہاں کہا ہے؟ اسی لئے ہم نے اوپر یہ کہنے کی جرأت کی، کہ مولانا سندھی نے اس مسئلے میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ، یا مولانا شہیدؒ دونوں میں سے کسی کی ٹھیک ترجمانی نہیں کی، مولانا شہیدؒ کی کتاب تو سب کے سامنے ہے، اس لئے ان کے مسلک کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے، باقی رہا اہل نجد کا مسلک، سو "سیرت ابن عبدالوہاب" جو اب تک نہیں چھپ سکی ہے، اسے میں اچھی طرح واضح کر چکا ہے، اہل نظر، خود اہل نجد کی تالیفاتؒ پڑھ کر کھرے کھوٹے کا فیصلہ کر سکتے ہیں،

یہ تھے "دو اساسی مسئلے" جن میں مولانا سندھی کے خیال کے مطابق "تقویۃ الایمان" اور "کتاب التوحید" کے فتوے ایک دوسرے کے "مناقض" ہیں اور نجد و حزب ولی اللہ کے بیچ یہ دو معرکۃ الآراء اختلافی مسئلے ہیں، جن کی بنا پر مولانا سندھی کا "ولی اللہی" "نجد کے" "وہابی" "سے تعاون نہیں کرسکتا،

اب رہ گیا یمن اور حزب ولی اللہ کا اختلاف، سو اس کے متعلق کچھ تو امام شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) کے سلسلہ میں عرض کیا جا چکا ہے، لیکن ایک دو باتیں رہ گئی تھیں، جی چاہتا ہے کہ وہ بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں، ہمارے مولانا نجد و یمن کا ذکر اس طرح ایک ساتھ

لہ اجمالی رائے قائم کرنے کے لئے سلیمان بن سحمان نجدی کے مرتب کردہ مجموعے (الھدیۃ السنیہ والتحفۃ الوھابیۃ النجدیہ) کا مطالعہ کافی ہوگا، اس میں پانچ چھوٹے رسالے ہیں۔

کر چکے آئے ہیں کہ گویا ان کے خیال میں ہندستان اور "ولی اللّٰہیت" کے خلاف نجد و یمن کا ہمیشہ "متحدہ محاذ" رہا کیا ہے اور شاید اسی لیے وہ نجدی اور یمنی دونوں تحریکوں سے یکساں برہم ہیں۔ لیکن اسے ہم کیا کریں کہ واقعہ نہیں حسب ذیل گذارشات سے نجد و یمن کی دائمی یک رنگی[۱] کی حقیقت بھی کھل جائے گی:

(الف) یمن کے نامور عالم محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) اصول و فروع میں مجتہد تھے، اس لیے کسی ایک فقہی مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی اور تقلید کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، ان کے برخلاف ابن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) حنبلی ہیں، اور حنابلہ میں بھی ان کا اعتماد زیادہ تر امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی تحقیقات و اجتہادات پر رہے

(ب) ابھی ابھی نجد و ہند کے دو اختلافی مسئلوں کا ذکر آیا ہے ان میں سے پہلے مسئلے (توسل فی الدعا) میں امام شوکانی، مولانا شہید کے ہم نوا ہیں، وہ انبیاء اور تمام صالحین کی ذات سے توسل جائز رکھتے ہیں (الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید: ص ۶ تا ۵)

(ج) دوسرے مسئلے (شرک اکبر و اصغر) میں وہ اہل نجد کے ہم خیال ہیں، (اگر مولانا سندھی کی رعایت سے اس مسئلے میں تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے درمیان ادنیٰ اختلاف بھی مان لیا جائے)، قبر پرستی (عبادۃ القبور) اور بت پرستی

---

[۱] مولانا نے اپنے خطوط میں اس کی تردید فرماتے ہیں، وہ نجد و یمن کو ایک نہیں سمجھتے رہی دونوں تحریکیں تو اس کی وجہ یہ ہے اگر ہندستانی اہل علم کے بعض طبقے ان سے متاثر ہیں، بیرون ہند سے ادنیٰ فکری تعلق بھی مولانا کے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے۔

(عبادۃ الاصنام) کے درمیان فرق کرنے والوں پر انھوں نے سخت حملے کئے ہیں'
(الدر النضید: ص ۱۲٬۴۰٬۳۵)

(د) زمان و مکان کی قربت کے باوجود امام شوکانیؒ (۱۱۷۳ھ-۱۲۵۰ھ) کو شیخ الاسلام ابن عبدالوہابؒ (۱۱۱۵ھ-۱۲۰۶ھ) کی دعوت کی صحیح نوعیت بھی نہیں معلوم ہو سکی تھی' البدر الطالع (ج ۲ ص ۵) میں انھوں نے امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۳۹ھ-۱۲۱۸ھ) کے کچھ حالات لکھے ہیں' تعریف کے ساتھ یہ فقرہ بھی درج ہے:-

ولکنھم یرون ان من لم یکن داخلاً تحت دولۃ صاحب نجد و ممتثلاً لاوامرہ خارج عن الاسلام...... (۲: ۵)	لیکن ان کا خیال ہے کہ جو فرماں روائے نجد کی حکومت میں داخل اور اس کے احکام کا تابعدار نہیں' وہ اسلام سے خارج ہے۔

پھر انہیں خود اس بیان کی صداقت پر شبہ ہوتا ہے' اور یہ فقرہ اضافہ کرتے ہیں:-

...... و ینقل عنھم اشیاء اللہ اعلم بصحتھا،	اور ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں' اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں۔

ان تصریحات کی موجودگی میں نجد و یمن کی وحدت پر زور دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ اس تفصیل سے راقم یہ دکھانا چاہتا تھا کہ جس طرح شاہ ولی اللہؒ اور ابن عبدالوہابؒ یا شوکانیؒ کے درمیان بعض مسئلوں میں اختلاف ہے' اسی طرح شوکانیؒ' اور ابن عبدالوہابؒ بھی ہر مسئلے میں متفق الرائے نہیں' اس لئے' نجد و یمن کو ایک کہنا' اور دونوں کو ولی اللہیت "کا" مناقض بتانا

ہیح نہیں، دنیا کی کوئی دو تحریکیں ہر ہر مسئلے میں متحد الرائے نہیں ہو سکتیں، اور
ں علم کو جزئی و فروعی مسئلوں میں سخت گیر نہیں ہونا چاہیئے، ورنہ تحقیق کی راہ
سدود ہو جائے گی۔

یہ صحبت بھی ختم ہونے کو آئی، پر اس تقابل اور موازنے کے سلسلے کی
ہ اہم بات رہ گئی، مختصر طور پر عرض کئے دیتا ہوں، ان دو اساسی مسئلوں
علاوہ جن پر ابھی گفتگو ہو رہی تھی، ولی اللٰہیت اور بیرون ہند کی توحیدی
ریکوں کے درمیان ایک بنیادی فرق اور رہ جاتا ہے، جس پر مولانا سندھی
بید اصرار ہے:-

"امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر مرکز
ہے، وہ امام ربانی کی وحدت شہود کو بھی وحدت وجود سے تطبیق
دیتے ہیں، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وحدۃ الوجود کے ماننے والوں سے
جس قدر شدید نفرت رکھتے ہیں، وہ دنیا کو معلوم ہے، جب کہ دونوں تحریکوں
کی الٰہیات میں اس قدر اختلاف ہو تو ان کو محض بعض امور کے اشتراک
سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔" (ص ۱۳۴)

مولانا صحیح فرماتے ہیں، امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) واقعی وحدۃ الوجود سے
شدید نفرت رکھتے ہیں، اور حضرت شاہ صاحبؒ (ف ۱۱۷۶ھ) کسی نہ کسی نہج سے
وحدۃ الوجود کو مانتے ہیں، بلکہ وہ ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) کی وحدۃ وجود اور
ربانی (ف ۱۰۳۴ھ) کی وحدت شہود کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش
ہیں، لیکن یہ کہنا کہ "امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود

کے مسئلے پر مرتکز ہے"۔ تھوڑی سی توضیح چاہتا ہے' اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ ان کی
دعوت اور تعلیمات کی بنیاد اور محور یہی فلسفہ ہے تو ہمیں اس سے شدید اختلاف
ہے' اور اگر یہ مفہوم ہے کہ شاہ صاحبؒ اپنے علم وفضل اور درجہ امامت کے
باوجود اس خاندانی میراث (عقیدۂ وحدۃ الوجود) سے دست بردار نہیں ہوسکے
تھے' تو صحیح ہے' اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح فقہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا رجحان
محاکمہ اور تطبیق کی طرف ہے' اسی طرح وحدۃ الوجود کے عقیدہ میں بھی ان کی ط
وسعت قلب اور خاندانی اثرات کے ساتھ تطبیق کا ذوق بھی کام کر رہا ہے
اس لیے ہم عقیدۂ وحدت الوجود کو شاہ صاحبؒ کی ذاتیات میں تو شمار کرسکتے
ہیں' مگر اسے مسلک ولی اللہی کی خصوصیت ماننے کے لیے تیار نہیں' اور تو او
خود شاہ صاحبؒ کے نامور پوتے مولانا شہیدؒ وجودیت کے قائل نہ رہ سکے' عر
تک تو وہ اپنے دادا کے نقش قدم پر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں تکیہ رائے بر
کے سید زادےؒ کے فیض صحبت سے فلسفہ وتصوف کا یہ غیر مطبوع رنگ بھی پ
پڑ گیا' سید صاحبؒ سے ان کی گہری وابستگی اور عقیدت (جس کا ذکر گزشتہ
صفحات میں آچکا ہے) کا تقاضا بھی یہی تھا' سید صاحب کے متعلق مولانا
کا یہ قول نقل ہوچکا ہے۔ معارف فروری ۴۳ء کہ ان کے خاندان میں ح
مجدد سرہندی اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہوگئی تھیں" اور یہ کہ ان کا خاندا
"اپنا خصوصی مشرب اور فکر رکھتا ہے"۔ (ص ۱۴۵) اس لیے حضرت سید شہید
تو امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) کے مسلک پر تھے ہی' مولانا شہید

(۱) حضرت مجدد الف ثانیؒ کا تصور توحید اور ان کا طریق فکر معلوم کرنے کے لیے۔ ملاحظہ ہو: برہان ...

بھی ان سے متاثر ہوئے، جس پر صراط مستقیم کے اوراق گواہ ہیں۔ (ص ۵، ۱۳، ۱۳۲، ۴۶، ۵۴، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۴۰، الخ الخ) افسوس کہ جگہ کی تنگی زیادہ پھیلاؤ سے روکتی ہے، اس لئے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے جو شہید رح کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے کافی ہے:۔

"......... و از جملہ بدعات ملاحدۂ وجودیہ کہ در خواص و عوام اشتہار یافتہ و با اقوال اکابر طریقت مشتہر گردیدہ، گفتگوہائے توحید وجودی الحادی است، کہ بگمان اتحاد خود با خدا ازاں لذتہائے نفسیاتی برمی دارند و بتسویل شیطانی و مکر نفوس خبیثہ بیان آں گفتگو را معارف وحقائق می پندارند ولا اقل از حضرات اہل اقوال او قات عزیزہ خود را بلا طائل محقق صرف می نمایند، پیشوائے ما محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم باں امر نفرمودہ وہرگز لب بربیان آں نکشودہ، پس ما را ازاں چہ سود ......" (صراط مستقیم، ۵۰ ۴، مطبع مجتبائی، دہلی)

"توحید وجودی الحادی" اور "بدعات ملاحدۂ وجودیہ" کے بعد امام ابن تیمیہ رح اور شہید رح کے (اللہ ان کی تربت پر انوار رحمت کی بارش کرے) کے درمیان بہت کم فرق رہ جاتا ہے، اور خاکسار یہی دکھانا چاہتا تھا، باقی حضرت شاہ صاحب رح کے

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) فاروقی کی کتاب *The mujaddids — Conception of Tauhid* اس میں حضرت شاہ صاحب رح، سید صاحب رح، مولانا شہید رح اور دوسرے بزرگوں کے مسلک پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔

متعلق ہم یہ عرض کر چکے کہ یہ عقیدہ ان کی ذاتیات میں ضرور داخل ہے لیکن مسلک ولی اللہی کی خصوصیت نہیں بن سکتا اور نہ حضرت سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کو مسلک ولی اللہی سے خارج کرنا پڑے گا، اور شاہ ولی اللہ کے ارہاص[1] امام ربانی کے ارشادات بھی اس مسلک ولی اللہی کے مناقض قرار پائیں گے، اور اگر مولانا سندھی کو اس پر اصرار ہے کہ حکمت ولی اللہی کی اساس یہی "وحدۃ الوجود" کا عقیدہ ہے، تو پھر ہمیں امام دار الہجرۃ سیدنا مالک بن انس (ف ۱۷۹ھ) کا مشہور قول:

کل واحد یوخذ منه ویرد علیه الا صاحب هذا القبر صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا، ہر شخص کے اقوال میں رد و قبول کی گنجائش ہے۔

پڑھ کر بصد ادب اس "حکمت ولی اللہی" سے برأت کرنا پڑے گی، اس لئے کہ ہمارا مرجع کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی انسان کا خود ساختہ فلسفہ نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا مفکر اور عالم کیوں نہ ہو۔

اس "وحدۃ الوجود" کے سلسلہ میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے، سید نذیر حسین صاحب محدثؒ (میاں صاحب دہلوی) سورج گڈھی مونگیری (م ۱۳۲۰ھ / ۱۸۰۵ء) کے متعلق مولانا سندھی کہتے ہیں کہ

---

[1] امام ولی اللہ کی تحریک کے لئے اگر کوئی بزرگ سلف صالح کا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ فقط امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے وجود میں منحصر ہے، ان کو امام ولی اللہ

بی وحدۃ الوجود کے قائل تھے،

"مولانا نذیر حسین، مولانا ولایت علی کے مدرسہ (صادق پور) پٹنہ

کے ابتدائی طالب علم ہیں، بہار سے جب دہلی پہونچے، تو الصدر

الحمید اور ان کے اصحاب کی صحبت میں ہی علمی تکمیل سے فارغ

ہوئے، غزوۂ دہلی تک مولانا محمد اسحاق کے مسلک کے پابند رہے

اس کے بعد اگرچہ بہ ضرورت نجدی تحریک اور شیخ الاسلام

ابن تیمیہؒ کی طرف میلان ظاہر کرتے رہے، مگر فتاوی عالمگیریہ

کا مشغلہ اور ہدایہ کی تدریس اور وحدۃ الوجود کا فلسفہ ان

کی پرانی ذہنیت کا عنوان آخر تک قائم رہا۔" (ص ۱۹۶)

جہاں تک وحدۃ الوجود کے عقیدہ کا تعلق ہے یہ پورے یقین کے

تھ کہا جا سکتا ہے کہ میاں صاحبؒ اس کے قائل نہیں تھے، شیخ اکبر ابن عربی

تعظیم وہ ضرور کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن عربی (ف ۶۳۸ھ)

تقلید شخصی کے سخت مخالف تھے، (الحیات بعد الممات ص ۲۱۰) اور ان

ادا میاں صاحبؒ کو بہت پسند آئی تھی، اور اسی لئے وہ شیخ اکبر کی تکفیر

مخالف تھے، مولانا سندھی نے الحیات بعد المممات کے حوالہ سے قاضی بشیر الدین

جی اور میاں صاحبؒ کے جس مناظرے کا ذکر کیا ہے، وہ ابن عربی کی تکفیر

کے مسئلے پر تھا، وحدۃ الوجود سے اس کا کوئی تعلق نہیں، (الحیات بعد الممات:

۱۲۳)

حب

بانی ہدایہ کی تدریس، فتاوی عالمگیری کا مشغلہ اور شاہ محمد اسحاق ف

مسلک کی پابندی تو یہ چیزیں ہمارے نزدیک ضمنی حیثیت رکھتی ہیں، یہ کون نہیں جانتا کہ ولی اللّٰہیوں میں میاں صاحبؒ کو مولانا شہیدؒ سے زیادہ عقیدت تھی، جس کا ذکر وہ بار بار کیا کرتے تھے، (الحیات بعد المماۃ: ص میاں صاحب کے مسلک کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (الحیات بعد المماۃ ص ۵۴، ۵۶، ۱۲۳، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۴۷)

خاکسار کو مولانا عبیداللہ سندھی کی زیر نظر کتاب (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک) سے متعلق جو کچھ عرض کر چکا، یہ فیصلہ کرنا تو اس وقت عاجز کے لئے بہت مشکل ہے کہ اس سے کہاں کہاں لغزشیں ہوئی ہیں، البتہ اپنی کوشش یہی رہی ہے کہ واقعات اور مسئلوں کی زیادہ سے زیادہ چھان پھٹک کر لی جائے پھر بھی اہل نظر سے درخواست ہے کہ وہ کوتاہیوں اور لغزشوں کی نشان دہی میں بخل نہ کریں، تحقیقی طور پر جو رہنمائی کی جائے گی وہ شکریہ کے ساتھ قبول ہو گی۔

یہ گذارش خاص طور پر اس لئے بھی کی جا رہی ہے، کہ راقم چند سالوں سے سید شہیدؒ اور ان کی دعوت تجدید و جہاد پر کچھ چھان بین کر رہا ہے، اور اللہ کے فضل سے اچھا خاصہ مواد بھی فراہم ہو چکا ہے، لیکن بعض گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں ترتیب و تبویب اب تک شروع نہیں ہو سکی ہے، اس لئے اس درمیانی منزل میں بزرگوں کی ہدایتیں اور دوستوں کے مشورے بہت کار آمد ہو سکتے ہیں۔

خیر راقم کو جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ تو عرض کر ہی چکا، لیکن اس کے بعد بھی

سیاسیات، مذہب و فلسفہ کے اس معجون مرکب میں مسموم اجزاء کی کمی نہیں، اولاً تو ...ہ وسیاست و مذہب کے اس معجون کا اصل نسخہ ہی غلط ہے، مگر خاکسار اس کی ...ل پر قادر نہیں کہ اس کے لیے تطبب ولی اللٰہی میں حذاقت ضروری ہے اور بدقسمتی ...خفیر شاہ صاحب کی تصنیفات پر بہت ہی سرسری نظر رکھتا ہے، لیکن اصل ... (ر ... ہ) کے علاوہ بھی اس معجون میں کچھ زہریلے اجزا موجود ہیں، جن ...یل کی ضرورت نہیں، وہ اتنے "زہریلے" ہیں کہ ان کا نگاہوں کے سامنے ...ا کافی ہے :-

"جو قومیں انگریزی فوج میں ملازمت کر کے اور یوروپین طریقے پر سپاہی بننا نہیں سیکھیں گی، وہ ہندستان کی آیندہ حکومت نہیں سنبھال سکتیں ہیں، باوجود ہزار ہا اختلافات کے سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی ہمیشہ تائید کرتا ہوں، کہ وہ میری قوم کو فوج میں بھیجنے کا حامی ہے، سو میں نوے فی صدی افراد جنگ میں مر سکتے ہیں، مگر دس جو واپس آئیں گے، وہ ہمارا اصلی سرمایہ ہوگا۔"

...سنیے :-

"ہم عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیں، اس کے بعد اس کو ترکوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھنا چاہیے، اب ترکوں نے اپنا قومی طریقہ یوروپین ازم بنا لیا ہے، ہم اس مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے پر اپنی قوم کو تیار کرنا چاہتے ہیں، ان حقائق سے ہمارے بڑے بڑے عالم ناواقف ہیں۔"

خیر اس وقت کے بڑے بڑے عالم ناواقف ہوں تو کوئی ہرج نہیں،
مشکل یہ ہے کہ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی ان "حقائق" سے ناواقف
پتہ نہیں حجۃ اللہ البالغہ کے کس باب میں "مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے" کی
کی گئی ہے، کیا مسلم قوم بھی ہندو قوم کی طرح کوئی پیدائشی قوم Nation
اسی سلسلے کا ایک اور وعظ ارشاد ہوتا ہے:-

"یورپ کے طریقے پر کاشت کاروں کو عالم بنایا جا سکتا ہے سب سے پہلے انھیں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے، اس کے لیئے ہمارا عربی رسم الخط ایک مانع قومی ہے کہ ایسے انسان کو جو چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے، اس کو یہ خط سکھانا جو ایک ایک حرف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے، سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لیئے بے حد دشوار ہے، رومن حروف جو علٰحدہ علٰحدہ لکھے جاتے ہیں، ایک دفعہ حرف شناسی کے بعد ساری عمر کے لیے انسان فارغ ہو جاتا ہے۔" (ص ۸۱)

آخر میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے حزب کو مخالف عناصر
قطعی پاک کرنے کی جو تجویز ص ۲۰۲ کے متن اور خصوصاً حاشیہ میں پیش کی
اور یورپ کی پارٹیوں کے طریق کار سے جو استدلال کیا گیا ہے، وہ کیا اس
کی تعلیم ہے؟

ہمارے نزدیک کتاب کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کو پڑھکر یہ معلوم
ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر حضرت حاجی امداد اللہؒ، بلکہ

مولانا محمود حسن صاحبؒ تک یہ تمام اکابر امت درحقیقت صرف سیاسی لیڈر اور سیاسی مفکر تھے، اور ان کی بزم میں یا دین و ملت اور ایمان و ایقان صرف فانوس رنگ و ب، تھا، شمع نہ تھی، صاف یوں کہئے کہ سیاست اور فکر انقلاب کی حقیقت پر دین ار کی اور حکمت ایمانی فقط بطور غلاف تھا، کیا ان بزرگوں کی بزرگی کی یہی حقیقی تعبیر ہے ؟ فاعتبروا یا اُولی الابصار،

اب یہ عاجز طول کلام کی معافی چاہتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی

پر

ایک ناقدانہ جائزہ

'مولانا عبیداللہ سندھی' از پروفیسر محمد سرور
کتابی سائز صفحہ ۴۸۳'
سندھ ساگر اکاڈمی' لاہور

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی شخصیت ایک عجیب و غریب شخصیت ہے،
ان کے افکار ان کی شخصیت سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہیں' ایک
گھرانے میں پیدا ہوئے' اسلام قبول کیا، دیوبند میں تعلیم پائی' سیاسیات
داخل ہوئے' اور اس طرح کہ ہندستان چھوڑنا پڑا، جلاوطنی کی زندگی
موسکو' انقرہ اور یورپ کے مختلف مقامات میں گذری' آخر میں حجاز
تھے' دس بارہ برس حرم کے سایہ میں بھی رہے' اور اب پانچ سال
ہیں کہ وطن کی کشش پھر انھیں ہندستان کھینچ لائی ہے

مولانا کی زندگی کوئی پرسکون زندگی نہیں رہی ہے۔ دنیا کے تمام نشیب
ز، دکھ سکھ اور رنج ومحن کی گھاٹیوں سے وہ کامیاب گذر چکے ہیں' اور
لہ سفینۂ عمر ساحل کے قریب آلگا ہے' وہ اپنے تجربات زندگی اور نصف
ی کے مطالعے کے نتائج سے ہمیں مستفید کرنا چاہتے ہیں۔

ہندستان آنے کے بعد پہلے پہل انھوں نے کلکتہ میں ایک تقریر کی'
سے ہمارے حسن ظن کو جھٹکا لگا۔ اس میں انھوں نے انگریزی لباس یب تن
اور لاطینی حروف اختیار کرنے کی تلقین کی تھی' ظاہر ہے کہ صرف "صاحبوں"
س اختیار کرلینے سے انسان "صاحب" نہیں ہوجاتا، اور نہ لاطینی حروف

برت لینے سے سائنس و فلسفہ کے اسرار کھل جاتے ہیں، یہ ایک سطحی اور مرعو
ذہنیت کی دعوت تھی، اور مولانا سندھی کی زبان سے ایسی باتیں سن کر طبی
پر بڑا دکھ ہوا۔

اس کے بعد الفرقان ولی اللہ نمبر دسمبر ۵۹ھ میں انھوں نے امام ول
کی حکمت کا اجمالی تعارف کرایا، گو اس میں بھی بہت سی باتیں قابل گرفت
مگر دوستوں نے یقین دلایا کہ "مولانا اپنے افکار کے اظہار پر قادر نہیں" اور
حال کچھ فرقہ ملامتیہ کا سا ہے، شروع شروع میں وحشت ہوتی ہے۔ پھ
مانوس ہو جاتا ہے" — ہم نے جی کڑا کر کے اس "اجمالی تعارف" کا بار بار مطا
کیا، مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری طبیعت اس سے مانوس نہ ہو سکی، یت
کی تبلیغ خواہ کتنے ہی معصومانہ انداز میں ہو ہمارے لئے ناقابل برداشت

اس "ہلکے سے تموج" کے بعد مولانا نے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاس
لکھی (۶۲ء) جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی، اہل صادق پور، اور ا
عام ماننے والوں پر انہوں نے نہایت سخت اور نا روا حملے کئے، ساتھ ساتھ
اور یمن کے مشہور اہل علم اور نامور محدثین کو بھی اس سلسلے میں دھر گھسیٹ
کتاب پر ایک مفصل تنقید "معارف" کے چار نمبروں (فروری، مارچ، اپریل،
۶۳ء) میں شائع ہو چکی ہے، جو اہل علم میں قبولیت کی نظروں سے دیکھی
یہ کتاب، اور الفرقان کا مقالہ، دونوں اہل علم اور خواص کے لئے
عام اور معمولی لکھے پڑھے لوگ ان سے اچھی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے
ان کا دائرہ اثر و نفوذ بہت محدود رہا۔ ان کے برعکس زیر نظر کتاب مولا

لائق شاگرد اور معتقد نے آسان زبان میں لکھی ہے جس میں ان کے تمام
باریکیاں اور پھیلا کر پیش کئے گئے ہیں، طرز بیان دلچسپ اور مؤثر ہے، واقعات
کی تسلسل اور افکار سلجھاؤ کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، غرض جہاں تک
مولانا کے افکار و آراء کا تعلق ہے، یہ کتاب ان کے پیش کرنے میں پوری طرح
کامیاب ہے، اور ہمیں یہ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اس کتاب سے
مطمئن ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ افکار کتاب و سنت کی روشنی
کہاں تک قابل قبول ہو سکتے ہیں؟

کتاب تقریباً چار سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، اور تقریباً پوری اسلامی
تاریخ پر مولانا کا تبصرہ اس میں آگیا ہے، وحدت انسانیت، انقلاب،
اسلامی تصوف، اسلامی افکار میں قومی و ملکی رجحانات، اسلامی ہندوستان،
اکبر اعظم، اورنگ زیب، شاہ ولی اللہ اور ولی اللہی سیاسی تحریک، مختلف
ابواب کے ماتحت مولانا کے خیالات و افکار کی تشریح کی گئی ہے۔

مصنف کا مقدمہ بھی اچھا خاصہ دل آویز اور دلچسپ ہے، اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اس وقت کیسی ذہنی کشمکش اور فکری الجھاؤ
میں گرفتار ہے۔

مولانا کے افکار کی تنقید اور مکمل جائزہ کے لئے بڑی فرصت اور پھیلاؤ
کی ضرورت ہے، افسوس کہ نہ اس وقت ہمیں اتنی فرصت نصیب ہے، اور نہ
اس رسالہ کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش ہے، سرسری طور پر ہم اتنا
بیان کر سکتے ہیں کہ مولانا سندھی، اسلام اور ہندستانی قومیت کا ایک معجون

مرکب بننا چاہتے ہیں تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسل
خوشی خوشی ہندستانی قومیت کا جز بن سکیں! اسی اعتبار سے وہ وحد
انسانیت اور وحدت ادیان کے قائل ہیں، مولانا کے نزدیک قرآن مجی
بھی اسی "بنیادی فکر" کا ترجمان ہے :۔

"اور یہ بنیادی فکر عالمگیر، ازلی، ابدی اور لازوال ہے، قرآن
میں بیشک اس کا جامہ عربی ہے"۔ (ص ۲۵)

لیکن یہ "عربیت"، "مشاہدۂ حق" کے بیان میں صرف "ساغر و مینا" کے
ہے (ص ۴۵) اصل حقیقت تو وہی ہے جو گیتا میں ہے، مولانا کے نزدیک گ
حق ہے، لیکن اس کی جو غلط تعبیر کی گئی ہے، وہ کفر ہے، گیتا کے متعلق،
والے جانیں، لیکن قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مولانا کی
انسانیت کا شارح ہے، اور نہ وہ "وحدت ادیان" کا قائل ہے : اس
حامل تو ایک "دین حق" اور "ھدیٰ" لے کر آیا تھا، تاکہ ساری کائنات ا
پابند ہو، اور اللہ کی زمین پر اسی کا قانون نافذ ہو، مولانا جن قوانین
اقتدار کو "رسوم" کہتے ہیں، وہ صرف رسوم نہیں، ان میں حدود اللہ بھی
اور "حدود اللہ" سے تجاوز کرنے والے کے لئے قرآن مجید کا لہجہ سخت

لیکن ہمارے مولانا تو "دین حق" کی دائمی برتری کو یا مانتے ہی
ان کے نزدیک اب "قرآنی حکومت" کا زمانہ گذر گیا۔ اور گذری ہوئی
واپس نہیں آسکتی :۔

"جو زمانہ گذر گیا، وہ پھر واپس نہیں آیا کرتا، جو پانی بہ جاتا ہے وہ

لوٹنا نہیں، قرآن پر عمل کرکے خلافت راشدہ کے دور اول میں
صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہ ویسی حکومت نہیں بن سکتی،
جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے ہیں، وہ حکمت قرآنی کے صحیح مفہوم
کو نہیں جانتے۔ بیشک خلافت راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت
کا نمونہ ہے، لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔" صفحہ ۲۴

"حکمت قرآنی" سے مولانا کی جو بھی مراد ہو، مگر ہم اسے "شریعت" سے الگ نہیں سمجھتے جو حکمت شریعت سے بے نیاز کر دے یا شریعت کو قرار واقعی اہمیت نہ دے، قرآنی حکمت نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا کے افکار میں یہ چیز بڑی طرح کھٹکتی ہے کہ وہ اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری نہیں سمجھتے:-

"مولانا نے فرمایا کہ میں دین کو اسی بنا پر انسانیت کے لیے ضروری
سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر فرد انسان کی انانیت بیدار
ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے یا اپنے خاندان
یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دین حق مان لیا ہے
اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا اس کو کافر
قرار دیا، اور یہ نہ دیکھا کہ دین کا جو مقصود حقیقی ہے، وہ ان کے
ہاتھ آتا بھی ہے یا نہیں"۔

جانے "ظاہری طور طریقوں" سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ کیا نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ کی ادائی، حج ادا کرنا یہ سب ظاہری طور طریقے ہیں اور

جو ان کا قائل نہ ہو، وہ رب العلمین کی بارگاہ میں مقبول ہوسکتا ہے؟ اور پھر ہمیں بتایا جائے کہ "محدود مذہب" سے مراد کیا ہے؟ کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے؟

اسلامی تصوف، کے باب (صفحہ ۱۲۴-۱۶۳) میں مولانا کا بیان بہت دلچسپ، مفید اور سبق آموز ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ موجودہ ہندی تصوف کا بڑا حصہ ویدانت اور ہندو یوگیوں کے طریقوں سے ماخوذ ہے۔" اصل جذبۂ تصوف" جسے حدیث میں "احسان" کہا گیا ہے، یقیناً خالص اسلامی چیز ہے، لیکن موجودہ فن تصوف، تزکیہ اور ریاضت کے نت نئے طریقے، بیرونی اثرات کی غمازی کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں:-

"ہمارے بعض علماء اس سے بہت چڑتے ہیں، انہیں یہ گراں گذرتا ہے کہ مسلمان صوفیاء نے ہندستان کے ویدانت سے استفادہ کیا، چنانچہ ایسے تصوف کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں، ...... ان ارباب علم وفضل کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ ایک ہے جذبۂ تصوف، اور ایک ہے علم تصوف، اس جذبۂ تصوف کو حدیث شریف میں احسان کا نام دیا گیا ہے .... اور جس طرح اور علوم کی تدوین میں دوسری قوموں کی تحقیقات اور تلاش و جستجو سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا ہے، اسی طرح تصوف کے طرق میں بھی دوسری قوموں سے استفادہ کیا گیا۔" (صفحہ ۱۳۱-۱۳۰)

"اسلامی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے۔"......

"یہاں پر ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی تصوف ویدانت کے فکر سے متاثر ہوا، اور ہندستان کے مسلمان صوفیا نے نفس باطنی کی اصلاح اور تصفیہ کے لئے ہندو یوگیوں سے ملتے جلتے طریقے اختیار کئے"۔ (صہ ۱۳۲)

بہر حال حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے، رہے ہمارے صوفی علما تو ان کی خفگی بجا ہے، یہ بزرگان دین، اور اللہ کے مرتاض بندے ان صوفیانہ ریاضتوں کو خالص اسلامی چیز سمجھتے ہیں، جب آپ کہیں گے کہ یہ چیزیں ہندوؤں سے لی گئی ہیں، تو ان کا نفس طبعی طور پر اس تلخ حقیقت کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔

لیکن مولانا کا مطلب دوسرا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمان صوفیوں نے ہندو یوگ کو منقح کیا، اس کی اصلاح کی، اور پھر اسی کو پاکیزہ شکل میں ہندوؤں کے سامنے پیش کیا:۔

"یہی وجہ ہے کہ ہمارا تصوف ہر سمجھدار ہندو کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ اگر فرقہ وارانہ تعصبات نہ ہوتے، اور ہندوؤں کے دلوں میں مسلمان کی ہر چیز سے نفرت نہ پیدا کر دی جاتی، تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمان عارفین کے فیض سے ہر ہندو کے دل میں اسلامی تصوف گھر کر لیتا۔ اور ہندستان کے سمجھدار طبقے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے"۔ (صہ ۱۲۳)

مگر سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ فرقہ وارانہ تعصبات شروع سے

موجود ہیں، اور ہندوستانی قومیت سے میل کی کوئی کوشش بھی ہندؤں کو اس سے قریب نہیں لا سکتی، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کھینچا تانی میں کچھ اسلام ہی کا رنگ پھیکا پڑ جائے، یہ کوئی خواہ مخواہ کا اندیشہ نہیں ہے، ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے، اکبر اور دارا شکوہ کی نامبارک کوششوں کا کیا یہی انجام نہیں ہوا؟

اسلامی تصوف کی طرح تاریخ اسلام کا بھی مولانا نے اپنے نقطہ نظر سے نہایت گہرا جائزہ لیا ہے، اُن کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ:۔

"اسلام گو بین الاقوامیت کی دعوت ہے، مگر وہ قومیتوں کا انکار نہیں کرتا"۔ (ص ۱۹۶)

وہ انسانیت، بین الاقوامیت، اور قومیت تینوں کو تسلیم کرتے ہیں، عقیدہ وحدۃ الوجود ان کے انسانی فکر کا ترجمان اور مظہر ہے؛ بین الاقوامیت کی جگہ وہ وحدت ادیان کو دیتے ہیں؛ قومیت کی تعبیر وہ خاص دین یا شریعت سے کرتے ہیں، وہ بیک وقت ان تینوں چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں:۔

"عقیدہ وحدۃ الوجود، وحدت ادیان، اور ایک مستقل دین کی جو بالترتیب جدا جدا حیثیتیں ہیں، ان کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ ان کی مثال انسانیت، بین الاقوامیت اور قوم کی ہے، میں انسانیت عامہ پر عقیدہ رکھتا ہوں، اور اسی بنا پر میں بین الاقوامیت پر بہت زور دیتا ہوں، لیکن انسانیت اور بین الاقوامیت پر عقیدہ رکھنے سے میرے نزدیک یہ لازم نہیں آتا کہ قوم کے مستقل وجود کو نہ مانا جائے".......

قوم، بین الاقوامیت اور انسانیت ایک سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بالعینہ میرا شخصی عقیدہ، میرا قومی اور ملی مذہب، وحدت ادیان اور وحدت الوجود، ذہنی ارتقاء کے مراحل ہیں"... صلا۱۵

گویا اسلام کی حیثیت آپ کے نزدیک صرف ایک قومی و ملی مذہب کی رہ گئی، وہ ایک "عالمگیر دین" نہیں رہا ــــــ لکھتے ہوئے جی گھٹتا ہے، پر کیا کیا جائے کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ایسا ہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہماری ناقص سمجھ کا قصور ہو۔

اسی قومیت اور وطن پرستی کے نشے میں مولانا عربوں اور عربی زبان اور "عربی قرآن" کے بارے میں ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو ہمارے نزدیک اسلام کی رُوح کے سراسر خلاف ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"...... بے شک ..... قرآن کا پیغام سب قوموں کے لئے تھا، لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب ہو جائے .... چنانچہ نبی کریم صلعم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک قومی، اور دوسری عمومی اور بین الاقوامی"۔ (صلا۱۹۱)

"...... اس ذہنیت کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی زبان کو مقدس مان لیا گیا، عربوں کو سب قوموں سے افضل بتایا گیا ...... بے سوچے سمجھے قرآن کی عربی متن کی تلاوت کرنا ثواب ٹھہرا ..." (صلا۱۹۲)

فہم قرآن پر زور دینا اور بات ہے، اور تلاوت کے ثواب سے محروم کرنا دوسری بات ہے۔ غالباً مولانا "تلاوت قرآن" کے ثواب کے منکر نہیں، عربی برتری

اور عربی تفوق کی تردید میں شاید یہ ان کی زبان سے نکل گیا ہو۔

"اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا۔ وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے، اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے، وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو، وہ اس کے نزدیک بیشک مذموم ہے، لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ ہے، مولانا کے خیال میں یہ ناممکن ہے۔ (ص ۱۹۶)

"اسلام کی دعوت" لاقومیت" کی دعوت نہیں تھی، بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کے مرکز بن گئے۔" (ص ۲۰)

ایک مسلم کی حیثیت سے ہمیں مولانا کے اس "فکر" کے قبول کرنے سے انکار ہے، اسلام، قومیتوں کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہی نہیں، اسلام قومیت کی تعمیر نہیں کرتا، وہ "حزب" کی تشکیل کرتا ہے۔ اسلام نے چند "اصول و مبادی" پیش کیے ہیں، جو انہیں قبول کرتا ہے، ان پر ایمان رکھتا ہے، اور انہیں اپنی زندگی کا دستور العمل بناتا ہے، وہ اس "حزب" کا رکن ہے، یا یوں کہیے کہ وہ اسلام کی بین الاقوامی برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔ نسل اور جغرافیہ والی قومیت کا تصور بھی اس کے قریب نہیں پھٹکنے پاتا؛ اصل یہ ہے کہ مولانا کے دل و دماغ پر روس اور اسٹالن چھائے ہوئے ہیں، جس طرح اسٹالن، اشتراکیت کے اصولوں میں ترمیم کر کے، اسے قومی رنگ دینے میں کامیاب ہو رہا ہے، اسی طرح ہمارے مولانا بھی اسلام کو قومی لباس پہنانا چاہتے ہیں، وہ ایسی قومی پارٹی بنانا چاہتے ہیں جو بین الاقوامی رجحان رکھتی ہو۔

اسی لئے وہ ٹروٹسکی جیسے "مومن قانت" اشتراکی کے مقابلے میں، اسٹالن جیسے ہوشیار اور زمانہ ساز کو پسند کرتے ہیں' —— یہ سب کچھ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں؛ زیر نظر کتاب میں پورے نو صفحے (ص ۲۲۹، ۲۲۰) اسلام اور اشتراکیت کی مماثلت کے نذر کئے گئے ہیں، افسوس کہ مضمون کی تنگ دامانی، طول طویل اقتباس کی اجازت نہیں دیتی، اس لئے صرف اس کا ابتدائی حصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جس میں اس "مشابہت و مماثلت" سے برأت ظاہر کی گئی ہے:-

"حاشا و کلا، ہمارا مقصود یہاں کسی قسم کا مقابلہ کرنا نہیں ہے، اور نہ کسی طرح کی مشابہت ثابت کرنے کی غرض ہے، لیکن تاریخ اسلام کے ان ادوار کو سمجھنے میں اس زمانہ کی ایک اور بین الاقوامی تحریک سے بڑی مدد مل سکتی ہے؛ خوش قسمتی سے یہ تحریک ہمارے سامنے اٹھی، ابھری اور پھیلی، اور مختلف مراحل سے گذری ہے ...... ہماری مراد اشتراکیت کی تحریک سے ہے"۔ (ص ۲۲۰)

غرض تو "مشابہت" ثابت کرنے کی نہیں ہے، لیکن اسلام کے تاریخی ادوار کو آپ دیکھتے ہیں اشتراکیت ہی کی تاریخ کی روشنی میں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں بھی ایک موقع (ص ۱۶۳ حاشیہ) پر یہ مماثلت پیش کی گئی ہے۔

اسی قومیت کا فیض ہے کہ مولانا سندھی کی آزاد طبیعت پر تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کی تنقید بھی شاق گذرتی ہے، "بد قسمتی" سے ہندستان کے

ہندستان کے ممتاز مسلمان اہل قلم بھی "عربیت" کے دل دادہ ہیں، اس لئے ان سے بھی ہمارے مولانا خوش نہیں :-

"......... ان کے [یعنی عربوں کے] اہل قلم نے تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کو ہمیشہ زوال، نکبت اور بے دینی کا عہد ثابت کیا، اسلام کی تاریخ کا یہ تصور ٹھیک نہیں، ہماری بدقسمتی ہے کہ اس زمانے میں ہندستان کے مسلمان اہل علم میں سے جن لوگوں نے بھی تاریخ اسلام پر کتابیں لکھیں، وہ عربی تصنیفات سے بہت متاثر ہوئے، اور چونکہ عربی زبان کو ہمارے ہاں مقدس سمجھا جاتا ہے اور اس زبان میں جو کچھ بھی لکھا ہوا ہو، اس کو الہام کا درجہ دیا جاتا ہے، اس لئے یہ خیال ہندستان کے اہل قلم میں بھی عام ہو گیا۔" (صفحہ ۲۴)

ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں کہ عربی زبان میں لکھی ہوئی ہر چیز کہیں بھی "الہامی" نہیں خیال کی جاتی۔ عربی زبان میں الہامی اور مقدس چیز صرف ایک ہے، اور وہ ہے کتاب اللہ، جس کے تقدس سے شاید ان کو بھی انکار نہ ہو، رہی تاریخ اسلام کے بعض غیر عربی ادوار کی تنقید و تنقیص، تو اس کے ذمہ دار وہ عجمی ہیں۔ جو اسلام کی صراط مستقیم سے دور جا پڑے۔

قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ اچھے خاصے ہوش مند مفکر اور وسیع النظر عالم کو راہ اعتدال سے کتنا دور لے جا سکتا ہے، اس کا اندازہ مولانا کے ان خیالات سے ہو سکتا ہے جو زیر نظر کتاب میں اسلامی افکار میں قومی اور ملکی

(رجحانات) کے عنوان سے مرتب کیے گئے ہیں' (ص ۲۶۲-۲۷۲)

"یہ صحیح ہے کہ دین اسلام کسی ایک ملک' قوم' یا زمانہ کے لیے مخصوص نہیں' اسلام تمام انسانیت کا دین ہے اور قرآن کریم انسانیت کے اسی دین کا ترجمان [اور قانون] ہے"۔

"اس عالمگیر قانون کو حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ جامہ اس عالمگیر قانون کی ایک تعبیر ہے' جو زمانہ' ماحول' اور اہل حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی۔ اس تعبیر کو اصل قانون کی طرح عمومی اور ابدی سمجھنا ٹھیک نہیں"۔ (ص ۲۶۲)

آپ سمجھے یہ "حجازی تعبیر" کیا چیز ہے؟ ہم سیدھے سادے مسلمان تو (اسے) محض "حجازی تعبیر" کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس کا اصلی نام "سنت" ہے' (جو) قرآن پر "زاید" تو نہیں' لیکن اس کی تفصیل و تشریح ضرور ہے' ائمہ اسلام (اس) "سنت" کو کتاب اللہ سے الگ نہیں قرار دیتے' بلکہ اسی کا تتمہ سمجھتے ہیں لیکن (م)ولانا فرماتے ہیں :-

"دین صرف قرآن میں منحصر ہے۔ اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے ...... اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے' اور وہ غیر متبدل رہے گی' لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے' تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں' قانون اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے' لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل

سکتے ہیں، ہم "سنت" انھیں تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں"۔

"سنت" مولانا کے نزدیک حجازی یا مدنی سوسائٹی کی ترجمانی ہے، اس

اس میں ان کے نزدیک تبدیلی ہو سکتی ہے، یہ "نظرِ عنایت" "سنت" ہی پر بس

نہیں کرتی، بلکہ اس کے بعد ایک قدم آگے بڑھ کر وہ قرآن کے احکام کو بھی

ابدی اور عالمگیر نہیں مانتے:۔

"مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں، وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں، عرب کے خاص حالات میں قرآن کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی عملی صورت دی جا سکتی تھی۔" (صہ ۲۵۴)

ایک دوسرے انداز میں اس کی تشریح ملاحظہ ہو:۔

"مولانا فرماتے ہیں کہ نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول ہی سے بنتی ہے، مثلاً ہندستان میں فطرۃً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں، اس لئے اگر کوئی ہندستانی ذبح حیوانات سے بچے [یعنی اپنے اوپر حیوانات کا گوشت حرام کرلے] تو اس کا یہ فعل خلاف نبوت نہ ہوگا۔" (صہ ۲۵۵)

یہ سب اسی جذبۂ وطن پرستی کے مظاہر ہیں جو مولانا کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جس کی گھونج میں انھوں نے مسلمانوں کی پوری

بیخ کھنگال ڈالی ہے۔

احکام قرآنی کی تبدیلی اور تغیر کے متعلق ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو جو بالکل واضح ہے اور کسی تبصرے کا محتاج نہیں :-

"غیر عرب اقوام کے لئے اس پیغام [یعنی قرآن کریم] کو جو بظاہر عربی شکل میں تھا، اپنانے میں جو دقتیں پیش آئیں، انہیں دو طرح سے حل کیا گیا۔ عربوں کو دوسری قوموں پر حکمرانی حاصل ہو گئی تھی، ان قوموں کے عوام نے تو شریعت کو اس لئے مان لیا کہ یہ حکمرانوں کا قانون تھا .... البتہ دوسری قوموں کے خواص کے لئے اس قانون کو اپنانے میں جو رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یوں دور ہو گئی کہ اس قانون میں لچک تھی۔ غیر عرب اقوام کے خواص کو اجازت تھی، اگر وہ چاہیں تو عربی قانون کو بجنسہ قبول کر کے عرب بن جائیں، یا اس کی روشنی میں اپنے لئے ایک قومی قانون بنائیں"۔ (ص ۲۶۱)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ "لچک" سے مولانا کیا مراد لیتے ہیں؛ پھر اگر "لچک" کی تاویل بھی کر لی جائے تو "قومی قانون" کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، رہ رہ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ سب اسی "وطنیت" کے جراثیم ہیں، جو مولانا سندھی جیسے دیدہ ور اور نکتہ رس عالم کو کعبہ سے ترکستان کی طرف لئے جا رہی ہے۔ ان کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں۔ عارف رحمہ سیالکوٹی نے کتنا سچ کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے (اقبال)

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، راقم اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھا تھا کہ جذبہ
کی بھی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہوگی، مگر مولانا سندھی کے افکار و سیاسی تعلیمات
سے واقفیت کے بعد اس خیال کی غلطی آشکارا ہوگئی۔ مسئلہ خلق قرآن اور اس
"قومی تشریح" پر مولانا نے جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں ان کو پڑھ کر یقین ہوگیا
اس جذبۂ وطن پرستی کی کوئی حد نہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی فتنہ سا
کہاں جاکر دم لیں گی، ممکن ہے بعض سیدھے سادے عقیدت مندوں کو
جملے ناگوار معلوم ہوں، مگر راقم ان سے ذرا صبر کی درخواست کرے گا آ
ذرا جی کڑا کر کے مسئلہ خلق قرآن کی "قومی تعبیر" سن لیجیے۔ اس کے بعد آپ ک
فیصلہ کا حق ہوگا۔ اب تک اشتراکیوں کی یہ خصوصیت مشہور تھی کہ وہ دنیا ک
تاریخ کی تعبیر معاشی عوامل کے ذریعہ کیا کرتے ہیں مگر اب معلوم ہوا کہ وہ اس خب
میں منفرد نہیں، ہمارے بعض ارباب فکر کا بھی یہ گمان ہے کہ اسلام کی پو
تاریخ کی تشریح و تعبیر "قومی نقطہ نظر" سے کر لیتے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> "مامون کے زمانے میں خلق قرآن کا بھی مسئلہ اٹھا، ایک گروہ کہتا
> تھا کہ "کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں سے ہے، وہ تو قدیم ہے
> لیکن جو الفاظ آنحضرت پر نازل ہوتے تھے، وہ مخلوق اور حادث
> تھے، محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے"۔ مامون
> نے پہلے گروہ کی حمایت کی اور اس خیال کو سلطنت کا اصولی مسئلہ
> بنادیا اور محدثین کی قیادت امام حنبل [احمد بن حنبل] نے فرمائی؛

خلق قرآن کے اس نزاع کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ مامون کے

زمانے میں عربوں کے ہاتھ سے سیادت کے سب ذرائع چھن چکے تھے، لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی اور اب وہ اسے خاص الٰہی زبان منوانے پر مصر تھے۔ عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم تو من جانب اللہ مانتے تھے لیکن قرآن کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور غیر فانی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، عربی الفاظ پر زور دینے والے حقیقت میں عربی تفوق کے قائل تھے"......

"محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا جائے اور یا اس مسئلہ کو گول ہی رکھا جائے کیونکہ عربی الفاظ کو مخلوق ماننے سے عربی تفوق پر زد پڑتی تھی" (صفحہ ۲۶۶)

ان "افکار زریں" کو پڑھیئے اور مولانا کی جودت طبع کی داد دیجیے، ور مسلمانوں کی بدقسمتی کا ماتم کیجیے کہ ان کے اہل نظر و فکر راہ حق سے کس قدر ہوتے جا رہے ہیں؟ فتنۂ خلق قرآن کی یہ تشریح بالکل غلط اور واقعات کے ف ہے! بات اتنی تھی کہ مامون کو مناظرہ کا شوق تھا۔ عیسائیوں سے ظرے میں "کلام اللہ" کو حادث کہہ گیا۔ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) "کلمۃ اللہ" ہو کر ق ہوئے تو پھر قرآن کلام اللہ ہوتے ہوئے کیوں مخلوق اور حادث نہ ہو!

اس کا سراغ ابن الندیم کے ایک بیان سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو: الکتاب الفہرست خامسہ فن ثالث ترجمہ ابن کلاب: صفحہ ۱۸۰، طبع یورپ)

اُدھر سے مطالبہ ہوا کہ" تمہارے علماء تو قرآن کو مخلوق اور حادث نہیں کہتے"۔ بادشاہ کا نشہ بڑا ہوتا ہے۔ دیر کیا تھی، دربار میں علماء کی طلبی ہوئی۔ کمزور دل والے زمانہ ساز علماء کی کبھی کمی نہیں رہی!....... لیکن اُنہی میں چند ایسے ارباب عزیمت و استقامت بھی تھے، جنہوں نے پوری پامردی اور بہادری کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ انہیں اذیتیں دی گئیں، قیدخانوں میں طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ لاکھوں کے مجمع میں بلا بلا کر دُرّے مارے گئے۔ بدن زخموں سے چور ہو گیا۔ مگر یہ اللہ کے بندے راہ حق سے نہ ہٹے۔ اور تاریخ پر ایک مستقل نشان چھوڑ گئے۔ آج پوری اسلامی تاریخ میں حسین بن علی (رضی اللہ عنہ و عن والدیہ) کے بعد احمد بن حنبل کا "موقف" اپنی نظیر نہیں رکھتا؛ دنیاوی مادہ پرست تحریکوں سے مقابلہ مقصود نہیں، مگر یہ سبیل تفنن عرض کیا جاتا ہے اگر موازنہ کا جی چاہے تو انقلاب رُوس، اور جدید ترکی کی تاریخ کھنگال کر دیکھئے ابن حنبلؒ کی استقامت اور برداشت کی مثال مشکل سے ملے گی:۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم — اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ذہانت اور اُپج سے ایک انوکھی بات کہہ دینا آسان ہے، مگر اسے ثابت کرنا مشکل ہے، کہاں عزیٰ تفوق کا جذبہ، اور کہاں ابن حنبلؒ اور ان کے رفیق کا افضل الجہاد" شتان مابین الارض والسماء" مولانا سندھی نے بھی زیادتی اور ظلم کی حد کر دی۔ ابن حنبلؒ کا تو یہ عالم تھا کہ دُرّے پڑ رہے ہیں، تہ بند کھل پڑتا ہے، بدن لہولہان ہو رہا ہے، وقت کا سب سے بڑا شہنشاہ (معتصم باللہ) کہتا ہے کہ اب بھی کہہ دو صرف زبان سے "مخلوق" کا لفظ ادا کر دو، مگر لب پر

ری ہوتا ہے تو یہ مشہور و ماثور فقرہ :-

"اعطونی شیئاً من کتاب اللہ عزوجل او سنۃ

رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اقول بہ" (جلاء العینین ص۱۰۱)

یہ یورپ کی مادیت کا لوہا ماننے والے کہتے ہیں کہ وہ پیکر صداقت و عاشق سنت
ف عربی زبان اور عربی تفوق کی خاطر اپنی جان گنوانے پر تلا ہوا تھا! اللہ
تا ہے کہ ان ائمہ صدق و صفا کے ایمان و اخلاص پر اس سے زیادہ بدنما
تان نہیں اٹھایا جا سکتا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

مولانا کہتے ہیں کہ "محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا
جائے یا اسے گول مول ہی رکھا جائے" ۔ اس "گول مول" کی حقیقت یہ ہے کہ سلف
کا ایک طبقہ صفات باری کے باب میں انتہائی محتاط تھا۔ امام مالک کا مشہور قول
ہے :- الاستواء معلوم والکیف مجہول والسؤال عنہ بدعۃ ؛ اسی
طرح کلام الٰہی کے بارے میں ایک طبقہ کہتا تھا :- "القرآن کلام اللہ لا اعرف
مخلوق او غیر مخلوق" ۔

یہ "گول مول" ضرور ہے مگر ٹال مٹول کا گول مول نہیں۔ اس اجمال کی تہ
میں عقیدہ کی پاکیزگی اور ایمان کا رسوخ ہے۔ اور یہ چیز استہزاء کی بجائے رشک
کی مستحق ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور مولانا فرماتے ہیں :-

"عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم تو من جانب اللہ مانتے تھے لیکن قرآن
کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور

غیر فانی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

اس پر چند سوال پیدا ہوتے ہیں :-

(i) دورِ عباسی کے وہ کون عجمی مسلمان تھے ؟ کیا عقیدۂ خلق کے قائلین اور منکرین کی تقسیم نسل اور قومیت کی بنیادوں پر تھی ؟

(ii) قرآن کے الفاظ کو غیر فانی تسلیم کرنے کے معنی یہ تو نہیں کہ من جانب اللہ بھی نہیں؟ مولانا کے بعض بیانات سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے

"دراصل بات یہ ہے کہ ایک عجمی کی عقل یہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ اللہ کی تعلیم جو تمام زبانوں اور سب دنیا کے لئے ہے وہ عربی اسلوب بیان اور عربی نظم الفاظ کی پابند ہو۔ عجمی ذہن کے لئے قرآن کے الفاظ کا غیر مخلوق سمجھنا ناممکن ہے، وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا۔" (ص۶۶)

"وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا"۔۔۔۔ اس فقرہ سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں کچھ اور تو نہیں مراد لیا جا رہا ہے؟ مولانا یہ بھی فرماتے ہیں :-

"مامون کے زمانے میں عربوں کے پاس لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی، اور اب وہ اسے خاص الٰہی زبان منوانے پر مصر تھے"۔ (ص۶۶)

دریافت یہ کرنا ہے کہ آپ عربی زبان کو کسی درجے میں الٰہی زبان ماننے بھی ہیں ؟ "خاص و عام" کی بحث تو بعد کی چیز ہے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، مسلک بالکل صاف ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ جو اس میں شک کرے، اس کے کفر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بھی

صحیح ہے کہ یہ اللہ کا کلام (قرآن مجید) عربی زبان میں ہے" تو اب عربی زبان ہی زبان ہوئی یا نہیں؟ مگر آپ کی عجمیت تو "حرف معانی ہی کو قرآن سمجھتی ہے"۔ اور آپ کے نزدیک اللہ کی تعلیم "عربی اسلوب بیان اور عربی نظم الفاظ کی پابند" ہو ہی نہیں سکتی،

اب یہ باب ختم ہوتا ہے، آخر میں ایک قومی نعرہ اور سُن لیجئے۔ نعرہ ہے تو وطن پرستانہ مگر زبان علم اور حکمت کی اختیار کی گئی ہے:۔

"مولانا کے نزدیک دہلی بھی دمشق و بغداد اور بخارا کی طرح مسلمانوں کے ایک مستقل مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح عرب مسلمان ایک مستقل قوم تھے، اور ان کا سیاسی مرکز دمشق اور بغداد رہا۔ اور ایرانی مسلمان ایک مستقل قوم ہیں، اور انہوں نے بخارا کو اپنا مرکز بنایا۔ اسی طرح ہندستانی ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی زبان ہے۔ اپنا فقہی مذہب ہے، اپنا علم کلام اور خاص حکمت ہے۔ جس طرح ایرانیوں نے عربوں سے اپنی قومی شخصیت منوائی، اور ایرانی زبان، ایرانی فقہ، ایرانی علم کلام، ایرانی تمدن مسلمانوں کی بین الاقوامی برادری کا ایک مستقل جزو بن گئے، اسی طرح ہندستانی مسلمان بھی ایک مستقل قوم ہیں۔" (ص ۲۷)

ایرانیوں نے جس طرح اپنی قومی شخصیت منوائی، اس کی بڑی دردناک داستان ہے، اس کا ذکر تو جب آجاتا تو اچھا تھا، رہا مسلمانان ہند کا اپنا فقہی

مذہب؛ تو ہمیں اس کا علم نہیں، ان کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند ہے جو صرف
ہندستان میں محدود نہیں۔ امام اعظم اور ان کے جانشینوں کا مرتب کردہ فق
افغانستان، ترکستان اور عربی ملکوں میں بھی رائج ہے، نیز خود اہل ہند
ایک بڑی تعداد "اہل حدیث" ہے جو محدثین کے طریقے پر چلنا اپنے لیے سرما
سعادت خیال کرتی ہے، ممکن ہے مولانا کا دماغ ان کا فکری وجود تسلیم نہ کرت
ہو، مگر ان کا وجود ہے، اور بہت نمایاں موجودہ ہندستان کے بعض چوٹی کے
علما عقائد اور فقہ دونوں میں محدثین اور سلف کا مسلک رکھتے ہیں۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ "ہندستانی مسلمان ایک قوم ہیں"، اب اس کی
دلیلیں ملاحظہ فرمایئے:۔

"اکبر تغلقوں کی طرح نہ تو قاہرہ کے عباسی خلفا کی دینی حاکمیت
کو تسلیم کرتا تھا اور نہ اسے اپنے باپ ہمایوں کی تقلید میں ایران
کے شیعہ بادشاہوں کی سرداری گوارا تھی، چنانچہ اس نے
ہندستان میں ایک مستقل صاحب اقتدار سلطنت کی بنیاد
رکھی، یہ خالص ہندستانی سلطنت کی ابتدا تھی" (ص ۲۸۶)

یہ ہے مولانا کی "ہندستانی سلطنت" کا نمونہ، جس کا وہ خواب دیکھ
رہے ہیں۔ اکبری بدعات کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جہاد سے کون
واقف نہیں؟ اس کی تازہ تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

"بدقسمتی سے ہندستان کے حالات کچھ اس قسم کے تھے، کہ اس فکر
سے ملک کی سیاسی زندگی میں خاطر خواہ نتائج نہ نکل سکے"۔

بات یہ ہے کہ جس طرح مامون کے اقدام سے عربی ذہن کے تفوق پر زد پڑتی تھی، .... اسی طرح اکبر کے زمانہ میں بھی ہندستان کے مسلمان حکمراں طبقوں نے محسوس کیا کہ اکبری مسلک سے اسلام کی برتری کو صدمہ پہنچے گا، اور اس کے ساتھ ان کی سیادت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی، چنانچہ یہاں بھی اکبری فکر کے خلاف بغاوت ہوئی، اور عالمگیر کے زمانے میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے رجحان کو حکومت کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ (صہ ۳۸۹)

گویا امام ربانیؒ بھی مسلمان حکمراں طبقوں کے جذبہ سیادت و تفوق کی تبلیغ کر رہے تھے، کہاں کی بات کہاں جا پہنچتی ہے؟

"ہندستانی قومیت" کے پرستاروں کے نزدیک "اکبر اعظم" سے زیادہ چہیتا کون ہو سکتا ہے، طبعی طور پر مولانا اس کے بڑے مداح ہیں:-

"چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرماں روا ہے، جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی، اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندستانی قومیت اور ان کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش"۔ (صہ ۲۹۳)

بالکل صحیح! یقیناً اکبر کی حکومت ہندستانی قومیت اور ہند و تمدن و تہذیب کو زندہ کرنا چاہتی تھی، مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے اصول و قوانین کے

اندر رہ کر ایسا ممکن بھی ہے ؟

"مولانا کے نزدیک وحدت الوجود کا عقیدہ اکبر کے فکر کی اساس تھا' اور اسی پر اس کے دین الٰہی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔" (صفحہ ۲۹۶'۲۹۷)

معلوم نہیں "وحدت الوجود" کے ماننے والے' مولانا کے اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ؟

اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوتا ہے :۔

"اکبری سیاست ایک دینی فکر کا نتیجہ تھا جس کا اساس وحدت الوجود کا عقیدہ تھا...... جہانگیر کے زمانے میں امام ربانی نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کی تردید کی' اور اس پر جس سیاست کی بنا پڑی تھی' اسے غلط ٹھہرایا۔ امام ربانی کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے با اقتدار سرداروں سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی' اور یوں بھی مسلمانوں کے حکمران طبقوں کا ان کی طرف مائل ہونا ایک طبعی امر تھا۔" (صفحہ ۳۰۷)

دیکھئے وہی بات مولانا دوسرے انداز میں کہہ رہے ہیں' کہنا یہی چاہتے ہیں کہ امام ربانی اس وقت کے مسلمان حکمران طبقوں کی نمایندگی کر رہے تھے اور انہیں اکبر کی بدعات اور اس کے بد اندیش وزیروں کی بیہودہ حرکتوں سے کوئی خاص اصولی اختلاف نہیں تھا۔ ورنہ مولانا سے زیادہ اسے کون جانتا ہے کہ معاملہ صرف ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کا نہیں تھا' معاملہ دین کا تھا۔ اکبر نے اس دین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا' جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

اس دنیا میں لے کر آئے تھے' اگر حضرت امام ربانی مجاہدانہ میدان میں نہ آتے تو نہ اورنگ زیب پیدا ہوتا' اور نہ ہم آپ اس حال میں ہوتے' ـــــ لیکن ہمارے مولانا ہیں کہ اکبر کی شہنشاہیت کو "ہندستانی اسلامی حکومت" کا نام دئے جا رہے ہیں :ـ

"اکبر کی حکومت حقیقت میں ہندستانی اسلامی حکومت تھی اس کے سیاسی مسلک میں ہندوستانیت کو اسلامیت پر ترجیح دی گئی تھی' کیونکہ ابتدائے کار میں اسلامی حکومت کو ہندستانی بنانے کے لئے لابدی طور پر ہندستانیت پر زیادہ زور دینا چاہیے تھا۔" (صفحہ ۳۰۹)

خاکسار عرض کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت ہندستان میں تھی کہاں؟ جسے اکبر اور اس کے حاشیہ نشین "ہندستانی" بنانا چاہتے تھے۔ مغلوں سے پہلے کی مسلمان حکومتوں کو کسی حال میں اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں! وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں' جن میں بادشاہ اچھے بھی ہوتے تھے اور برے بھی:ـ اکبر پہلا بادشاہ ہے' جس کے دور میں وہ مسلمانیت بھی ختم کر دی گئی' اور صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ دین ہی کے بیخ و بن سے اکھاڑنے کی مہم شروع کر دی گئی'ـ اور ایک نئے "دین الٰہی" کی بنا ڈالی گئی' ممکن ہے مولانا کے نزدیک یہ "ہندستانیت" ہو' مگر کتاب و سنتِ رسول پر ایمان رکھنے والا اسے الحاد و زندقہ سمجھنے پر مجبور ہے۔

اورنگ زیب کی دینداری اور مذہبی پالیسی کی توجیہہ بھی مولانا نے مخصوص انداز میں کی ہے' جو سننے کے لائق ہے۔ ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم

تھا کہ عالمگیر حجاز پر بھی اپنا اقتدار چاہتا تھا، اور اس کی سیاست کی تہ میں اسلامی دنیا کی قیادت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ہم مولانا کو جھٹلانے کی جرأت تو کر نہیں سکتے، البتہ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ سازی کے لیے بھی کچھ قرائن اور شہادت کی ضرورت ہوا کرتی ہے ــــــ بہر حال مولانا کی توجیہہ ملاحظہ ہو:۔

"اکبر کی سلطنت ہندستانی اسلامی سلطنت تھی، اورنگ زیب چاہتا تھا کہ وہ اس ہندستانی اسلامی سلطنت کے دائرہ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آجائیں اور حجاز پر بھی اس کا اقتدار ہو۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا، جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا...... اورنگ زیب کے پیش نظر ہندستان کے علاوہ اسلامی دنیا کی قیادت تھی، اس لیے [اس نے] اسلامیت کو مقدم جانا"۔

مولانا کو "جمع اضداد" میں کمال حاصل ہے، وہ اکبر اور عالمگیر دونوں کے مداح ہیں، اکبر پر اس لئے فریفتہ ہیں کہ اس نے "خالص قومی ہندستانی سلطنت کی بنا ڈالی"، اور عالمگیر کی یہ ادا انھیں بھاتی ہے کہ اس نے بیرون ہند میں ہندستان کی عظمت کا جھنڈا بلند کیا:۔

"دوسرے لفظوں میں اشوک کے ہزارہا سال کے بعد ایک بار پھر ہندستانی اس قابل ہوئے کہ وہ دوسروں کی سیاسی اور ذہنی

"ترکتازیوں کی آماجگاہ بننے کی بجائے اپنا پیغام باہر کی دنیا کو سنائیں، گو اشوک کے زمانے میں یہ پیغام بدھ مت کا تھا اور عالمگیر کے عہد میں یہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا پیغام تجدید اسلام تھا۔" (صہ ۳۱۶)

"فکری ترکتازیوں" کا فقرہ قابل غور ہے۔ شاید مولانا کے نزدیک اسلام اور متقدمین ائمہ اسلام کے اثرات بھی "فکری ترکتازیوں" میں داخل ہوں، مولانا سندھی ہندستان میں حکمت ولی اللٰہی کے داعی ہیں، اور انھیں شاہ صاحبؒ کی کتابوں پر بے نظیر عبور حاصل ہے۔ مگر وہ شاہ صاحبؒ کے افکار جس طرح پیش کرتے ہیں اس سے خود شاہ صاحبؒ سے بدگمانی ہونے لگتی ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ بھی اکبر اور عالمگیر دونوں کے قائل تھے، ——— شاہ صاحبؒ اکبر کے قائل ہوں، اس کی سیاست کے ثناخواں ہوں، یہ بات ناقابل ہے، جب تک صریح شہادت نہ پیش کی جائے ——— بہرحال مولانا کا بیان ملاحظہ ہو:-

"........ اہل فکر کی یہ جماعت سلطنت کے ان لوگوں سے واقف تھی، وہ اکبر کے سیاسی اعمال کے حامی نہ تھے، لیکن جس نہج پر اکبر نے مختلف ملتوں کو ہم نوا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اصولاً اس سے متفق تھے۔ اسی طرح وہ عالمگیر کی اسلام پرستی کے قائل تھے، لیکن اسلام پرستی نے امور سلطنت میں جو سخت گیری کی روش اختیار کی تھی، اس کے خلاف تھے، شاہ

ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم اور ان کے ہونہار فرزند امام
ولی اللہ ان کے افکار کے مرتب کرنے والے ہیں۔" (صـ ۳۱۹)

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کا مصنف اس "نہج" سے اصولی طور پر متفق ہو" جو اکبر نے مختلف طبقوں کو ایک کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ؟

زیر نظر کتاب میں ایک باب ولی اللہی سیاسی تحریک پر بھی ہے' (صـ ۳۲۱'۳۴۱) یہ گویا مولانا کی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک کا خلاصہ ہے' اس "خلاصہ" میں بھی نجد و یمن کے محدثین' عام اہل حدیث اور بدنام و مظلوم وہابیوں پر نظر عنایت مبذول ہوئی ہے (صـ ۳۳۵) جسے ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں کہ ان پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے' (معارف ۔ فروری' مئی ۱۹۴۳ء)

کانگریس پر بھی مولانا کے افکار قابل دید ہیں' (صـ ۳۴۰'۳۴۱)' مگر ہمیں ان کی توضیح و تشریح سے اتفاق نہیں کہ ہم وطنیت اور قومیت کو اسلام کے لئے زہر قاتل سمجھتے ہیں' اور مولانا اس کے سرگرم داعی ہیں' وہ ہر فکر میں وطن پرستی کا سراغ لگا لیتے ہیں' البتہ انھوں نے گاندھی جی اور کانگریس کی ہندوانہ قومیت سے متعلق بڑی معقول باتیں کہی ہیں' اسی سلسلے میں انھوں نے مولانا حسین احمد صاحب کی سیاست پر بھی دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی ہے:۔

"مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے' مولانا حسین احمد المصطفےٰ الکمال کی ترکی تحریک کے تو خلاف ہیں' لیکن حکومت برطانیہ کی عداوت میں اتنی کبھی غور نہیں کرتے کہ گاندھی جی ہندوستانی تحریک چلا رہے ہیں اس سے

ہندستان کے مسلمانوں کی قومی شخصیت کو کس قدر نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔" (ص ۳۵۹)

اس تحریر کے ختم کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ مولانا کا ایک وطن پرستانہ جز" ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کر دیا جائے۔ خوبی یہ ہے کہ اس جز تصنیف کا سہرا بڑے بڑے بزرگوں کے سر باندھا گیا ہے:۔

"دیوبندی اسکول ہند کو کیا سمجھتا ہے۔ اس کے لئے سبحۃ المرجان نام کی عربی تاریخ ہند پڑھیئے۔ قدیم مذاہب ہند کے متعلق ان کے نظریات مرزا مظہر جان جاناں اور امام عبدالعزیز دہلوی کے مکتوبات میں ملیں گے"۔۔۔۔۔ میں ان کی ترجمانی مختصر الفاظ میں بیان کرتا ہوں' ہمارا ہندستان دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان رفعت کا مالک ہے'۔ پہلے دور میں اس نے سنسکرت جیسی زبان پیدا کی' کلیلہ و دمنہ جیسی حکمت کی کتاب لکھی'۔ فوجی تربیت کا کھیل شطرنج ایجاد کیا۔ ریاضی میں یونان کا ہمسر تھا۔ الہیات میں ویدانت فلاسفی سکھانے میں "جگت گرو" تھا۔ اس سے ویدک دھرم اور بدھ دھرم دُنیا میں پھیلے' اس نے مہاراجہ اشوک جیسے حکمراں پیدا کئے'۔ دوسرے دور میں قدیم انسانیت کی علمبردار سوسائٹی کو اسلام جیسی انٹرنیشنل پروگرام سے آشنا کرنے والا جلال الدین اکبر پیدا کیا۔ مشرقی ایشیا کی زبانوں کو ملاکر اردو جیسی انٹرنیشنل زبان پیدا کی' محی الدین عالمگیر جیسا سلطان

پیدا کیا جو تمام ممالک ہند کو ایک قانون کا پابند بنا سکھا گیا۔

امام ولی اللہ جیسا فلاسفر پیدا کیا"۔ (ص ۳۴۸-۹)

اس "رجز" کے اور مصرعے جیسے بھی ہوں، مگر اکبر والا مصرعہ تو "غیر موزوں" ہے؛ کہاں مولانا کا چہیتا اکبر اعظم، اور کہاں اسلام کی اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے۔

ارادہ ایک مختصر تبصرہ لکھنے کا تھا؛ مگر کوشش کے باوجود تحریر کچھ نہ کچھ طویل ہو ہی گئی؛ پھر بھی نقد کا حق ادا نہ ہوا۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب نظر عالم پوری کتاب پر بسط و شرح کے ساتھ گہری نظر کرے۔ راقم نے اپنی بساط کے مطابق صرف نمایاں اور زیادہ قابل اعتراض حصوں کی نشان دہی کر دی ہے۔